www.shibliinternational.com

May 2020

ISSN: 2581-9216

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly SADA E SHIBLI Hyderabad

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

-/20 روپے

Issue27 شمارہ_Vol:3 جلد

مئی May :2020

ماہنامہ

صدائے شبلی

حیدرآباد

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبدالقدوس ☆ ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامی
پروفیسر مظفر علی شہہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی
پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی،
ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی،
مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ
محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال
ڈاکٹر ناظم علی، ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو
ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر سید امام حبیب قادری، ڈاکٹر
فاروق احمد بھٹ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، مولانا احمد نور عینی
ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابوہریرہ ایوبی، محسن خان

SADA E SHIBLI
A/c: 1327102000023922
IFSC CODE: IBKL0001327
IDBI BANK, CHARMINAR HYD, TS

قیمت فی شمارہ: 20
سالانہ: 220 - بیرونی ممالک: 50/ امریکی ڈالر
خصوصی تعاون: 1000

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

Email: sadaeshibli@gmail.com

9392533661 8317692718

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ (قسط:۲۴)	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۷
۴	ایمان بالآخرت	مولانا صدر الدین اصلاحی	۱۰
۵	سمندر ہے درمیاں......فکر وخیال کا جمال احساس شعری امتزاج	ڈاکٹر ریاض توحیدی	۱۲
۶	نجیب محفوظ: ایک عہد ساز شخصیت	نواز احمد	۱۵
۷	آہ! مزدور (نظم)	نیاز جیراج پوری	۱۷
۸	ٹوپی والا وائرس (افسانہ)	آیناز جان علی	۱۸
۹	کرونا وائرس (نظم)	احمد علی برقی	۲۲
۱۰	پروفیسر محمد انصار اللہ: ایک تعارف	ثنا غزل	۲۳
۱۱	ایرانی معاشرے میں مرد سالاری کا وجود جلال آل احمد......	منظر عباس زیدی	۲۷
۱۲	محمد قلی قطب شاہ کی عشقیہ شاعری: ایک جائزہ	منظور حسن	۳۰
۱۳	کورنا وائرس: غور وفکر کے چند پہلو	عائشہ صدیقہ ج	۳۵
۱۴	کورونا وائرس (نظم)	جلیل نظامی	۳۶
۱۵	پیام سعیدؒ	محمد زاہد ناصری القاسمی	۳۷
۱۶	فیض احمد فیض: شخصیت وشاعری	عطیہ نفیس	۳۸
۱۷	ادا جعفری اور ان کا ذوقِ مطالعہ	شیخ اسماء امروز	۳۹

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

ابو سفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی...... الحاج **محمد منیر الدین عرف ولی**، آغا پورہ حیدرآباد
ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد...... الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ولیج سکندرآباد حیدرآباد
علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر)...... **علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)
الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ولیج سکندرآباد حیدرآباد...... **محمد عبد الماجد** ایڈوکیٹ،، سکندرآباد، حیدرآباد
جناب قاضی **فیض الدین**، اپرتوڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج
چارمینار، حیدرآباد...... مولانا **محمد عبد القادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد۔
الحاج **محمد قمر الدین**، نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

اپنی بات

ماہ مئی کی پہلی تاریخ کو یوم مزدور منایا جاتا ہے۔اس کے منانے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ مزدور معاشرے کی اہم طاقت وضرورت ہے،اس وجہ سے اس کی توقیر کرنا انسانی فریضہ ہے۔اگر غور سے دیکھا جائے تو دنیا کے تمام شعبۂ حیات میں مزدور کا ہونا ناگزیر ہے کیونکہ دنیا کی سہولت میں اس کا خون وپسینہ شامل ہے،جسم،گاڑی،لباس،سڑک،مکان،کھیتی وکھلیان سے اس کی محنت شاقہ کا پتہ چلتا ہے۔کرونا وائرس کی مہاماری نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے،امیر وغریب سبھی متاثر ہیں،لیکن مزدور دوہرا متاثر ہوا،بیماری کا ڈر،بھوک،فاقہ،نوکری کا ڈر،ایسے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مزدوروں کو خوف سے کیسے نکالا جائے؟ ذمہ داری کس پر ہوگی؟ حکومت پر ہوگی،حکومت نے بیماری سے بچنے کے لیئے پورے ملک میں دیر ہی سے سہی لاک ڈاؤن کیا،ناقص پلاننگ کی وجہ سے پلان تقریباً فیل ہوگیا،کیونکہ مایوس مزدوروں کی ریل کی پٹری پر کٹی پھٹی لاشیں،سفر میں پیدل،پریشان حال چلتے ہوئے ان کے چھوٹے بچے بچیاں،بیویاں،مائیں،بہنیں،رکشہ ٹھیلہ سائیکلوں پر وطن مالوف کی محبت میں جان بچانے کے لیئے بھاگتا مزدور،ٹرین میں بھوک سے مری پڑی ہوئی لاش،پلیٹ فام پر مردہ ماں کی چادر کھینچتا اور کھیلتا ہوا بچہ،یہ چند ایسی دردناک تصاویر ہیں جنھیں دیکھ کر کلیجہ منھ کو آتا ہے اور دل کانپ اٹھتا ہے اور یہ سلسلہ تادم تحریر جاری ہے۔اللہ رب العزت ان پریشان حال لوگوں کی مدد فرمائے آمین۔

مرکزی حکومت اور بیشتر ریاستی حکومتوں نے پیکیج کا اعلان کیا،عملی طور پر کانوں کو خوش کرنا جیسا معلوم ہوا،اس سے قبل ماضی میں پندرہ لاکھ کا جملہ وعدہ اب بھی وزیراعظم کا تعاقب کرر ہا ہے۔اور اس وقت بیس لاکھ کڑور کا اعلان کتنا عملی جامہ پہنتا ہے آنے والا وقت ہی بتائے گا،فی الحال ملک میں حکومت کے اسباب حل وعقد نے اسباب کے دروازے کو بند کر کے عوام کو مسبب الاسباب کے حوالے کردیا ہے،اور اپنے اکاؤنٹ کو صرف آمدان کمنگ کردیا ہے جبکہ انھیں مشکل حالات میں چند ریاستی حکومتیں،ادارے،تنظیمیں،پریشان حال مقیم ومسافر کی مدد کرر ہے ہیں ادارہ انھیں سلام پیش کرتا ہے۔

مساجد،مدارس،قبرستان،سماجی ضرورتوں کے لیئے ہمارے آباواجداد نے اراضیات واملاک وقف کیں،واقف کی منشاء کے مطابق موقوفہ کا استعمال ہونا چاہیئے اگر خلاف ہوا جیسا کہ بیشتر ہورہا ہے تو یاد رکھنا چاہیے کہ آخرت میں سخت پکڑ ہوگی،حالیہ دنوں میں مسلم قبرستان متولیوں کی ناعاقبت اندیشی یا جہالت کی وجہ سے ایک مسلم میت کو ہندو شمسان گھاٹ میں دفن کیا گیا بحیثیت مسلمان افسوس کا مقام ہے۔

اردو ادب وصحافت کی مقبول شخصیت،طنز ومزاح کے ذریعہ انمٹ نقوش چھوڑنے والے مجتبیٰ حسین اسی ماہ مئی اور رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے خداوند قدوس مرحوم کی مغفرت کرے،پسماندگان متعلقین کو صبر دے آمین،ادارہ ان کی علمی،ادبی،سماجی خدمات پر خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

عدل وانصاف:

کوئی شخص گوشہ نشیں ہوکر بیٹھ جائے تو اس کے لیے عدل وانصاف سے کام لینا نہایت آسان ہے، آنحضرت کو عرب کے سیکڑوں قبائل سے کام پڑتا تھا، یہ آپس میں ایک ایک کے دشمن تھے، ایک کے موافق فیصلہ کیا جاتا تو دوسرا دشمن بن جاتا، اسلام کی اشاعت کی غرض سے ہمیشہ آنحضرت کو تالیفِ قلوب سے کام لینا پڑتا، ان سب مشکلات اور پیچیدگیوں پر بھی عدل وانصاف کا پلہ کبھی کسی طرف جھکنے نہ پاتا۔

فتح مکہ کے بعد تمام عرب میں صرف طائف رہ گیا تھا، جس نے گردنِ تسلیم خم نہیں کی، آنحضرتؐ نے اس کا محاصرہ کیا لیکن پندرہ بیس روز کے بعد محاصرہ اٹھا لینا پڑا، صخر ایک رئیس تھے، ان کو یہ حال معلوم ہوا تو خود جاکر طائف کی حصار بندی کی اور اہلِ شہر کو اس قدر دبایا کہ بالآخر وہ مصالحت پر راضی ہوگئے، صخر نے بارگاہِ نبوت میں اطلاع کی، مغیرہ بن شعبہ ثقفی آنحضرتؐ کی خدمت میں آئے کہ صخر نے میری پھوپھی کو قبضہ میں کر رکھا ہے، آپؐ نے صخر کو بلا بھیجا اور حکم دیا کہ مغیرہ کی پھوپھی کو ان کے گھر پہنچادو، اس کے بعد بنوسلیم آئے کہ جس زمانہ میں ہم کافر تھے، صخر نے ہمارے چشمہ پر قبضہ کرلیا تھا، اب ہم اسلام لائے، ہمارا چشمہ ہم کو واپس دلایا جائے، آپؐ نے صخر کو بلا بھیجا اور فرمایا کہ جب کوئی قوم اسلام قبول کرتی ہے تو اپنے جان ومال کی مالک ہوجاتی ہے، اس لیے ان کو ان کا چشمہ دے دو، صخر کو منظور کرنا پڑا، راوی کا بیان ہے کہ جب آنحضرتؐ کے حکم سے صخر نے دونوں حکم منظور کیے تو میں نے دیکھا کہ آنحضرتؐ کے چہرہ پر شرم سے سرخی آگئی کہ صخر کو دونوں معاملوں میں شکست ہوئی اور فتح طائف کا ان کو کوئی صلہ نہ ملا۔

ایک دفعہ ایک عورت نے جو خاندانِ مخزوم سے تھی، چوری کی، قریش کی عزت کے لحاظ سے لوگ چاہتے تھے کہ سزا سے بچ جائے اور معاملہ دب جائے، حضرت اسامہ بن زیدؓ رسول اللہؐ کے محبوب خاص تھے، لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ سفارش کیجئے، انہوں نے آنحضرتؐ سے معافی کی درخواست کی، آپؐ نے غضب آلودہ ہوکر فرمایا کہ بنی اسرائیل اسی کی بہ دولت تباہ ہوئے کہ وہ غربا پر حد جاری کرتے اور امرا سے درگذر کرتے تھے۔

خیبر کے یہودیوں سے جب صلح ہوکر وہاں کی زمین مجاہدین میں تقسیم کردی گئی تو عبداللہ ابن سہل ایک دفعہ کھجوروں کی بٹائی کے لیے گئے، محیصہ ان کے چچیرے بھائی ساتھ تھے، عبداللہ گلی میں جارہے تھے کہ کسی نے ان کو قتل کرکے لاش ایک گڈھے میں ڈال دی، محیصہ نے رسول اللہؐ کے پاس جاکر استغاثہ کیا، آنحضرتؐ نے فرمایا "تم قسم کھاسکتے ہو کہ یہودیوں نے ان کو قتل کیا" بولے "میں نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا" آپؐ نے فرمایا تو یہود سے حلف لیا جائے؟ بولے "حضرت! یہودیوں کی قسم کا اعتبار کیا، یہ سو دفعہ جھوٹی قسم کھالیں گے"۔

خیبر میں یہود کے سوا اور کوئی قوم آباد نہ تھی، یہ یقینی تھا کہ یہودیوں ہی نے عبداللہ بن سہلؓ کو قتل کیا ہے، تاہم کوئی عینی شہادت موجود نہ تھی، آنحضرتؐ نے یہود سے تعرض نہیں فرمایا اور خوں بہا کے سو اونٹ بیت المال سے دلوائے۔

دیباچوں میں ذکرِ شبلی کا مطالعہ

متنی تحقیق سے اس قدر بے اعتنائی تو شاید ہی انھوں نے اپنی کسی اور مدونہ کتاب میں ہوگی، بہر حال ان کی بدولت مکتبہ جامعہ کا ایڈیشن شائع ہوا اور اب تک اس کے تین ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں، تاہم انھوں نے موازنہ پر اظہار خیال ضرور کیا ہے۔ چند صفحے کے تعارف میں موازنہ اور اس کے مصنف کا ذکر بڑے موثر طریقے سے کیا گیا ہے۔ شبلی کی عظمت وجامعیت اور ادب وانشاء کے بارے میں جن خیالات کا انتخاب ''مضامین شبلی'' کے تعارف میں کیا گیا تھا اس میں بھی اس کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ البتہ اس ضمن میں شبلی کی بعض انفرادیت جس کا ذکر انتخاب میں نہ آسکا تھا اس میں بیان کر دیا ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''شبلی کے مزاج میں احساس تناسب بلا کا تھا اور ان کا اسلوب تحریر اس کا آئینہ ہے۔ علمیت، وقار، بلند آہنگی اور جوش بیان کے اجزاء، زبان کی صفائی، سلامت اور شستگی میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ خالص علمی انداز بیان کے باوجود ان کی زبان علمیت کے بوجھ سے دہری نہیں ہوتی۔ ان کی تنقید میں بھی اسی شائستگی کی جلوہ گری نظر آتی ہے''۔ (تعارف ص ۵)

شبلی نے موازنہ میں اپنے موقف کی تائید میں کثرت سے اشعار نقل کیے ہیں، یہ انتخاب بھی دراصل ذوقی معاملہ ہے، شبلی کے بلند ادبی ذوق کا کون معترف نہ ہوگا۔ لکھتے ہیں:

> ''اچھے اشعار کے انتخاب اور ان کے محاسن کی مختصر لیکن جامع وضاحت میں بہت کم لوگ ان کے حریف قرار دیئے جاسکتے ہیں، حیرت انگیز جامعیت کے ساتھ ان کی نگاہ انتخاب ایسے اشعار اور ایسے اجزا کو منتخب کر لیتی ہے جو کسی شاعر کا حقیقی سرمایہ کمال ہوتے ہیں اور ان کی خصوصیات کو اس خوش سلیقگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس شاعر کے ساتھ ساتھ خود شاعری سے اپنے آپ کو قریب تر محسوس کرتا ہے''۔ (ایضاً ص ۶)

خاں صاحب نے شبلی کے نہ صرف ذوق انتخاب کی داد دی ہے بلکہ ہماری ادبی زندگی پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے، ان کی بھی نشاندہی کی ہے، یہی نہیں ان کے نزدیک میر انیس کی مقبولیت کا راز بھی اسی کتاب سے وابستہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ واقعہ ہے کہ شبلی کے حسن انتخاب اور ان کے بے مثال انداز تشریح نے بے شمار لوگوں کے ذوق سخن اور ذوق انتخاب کی تربیت کی ہے، شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر کو جن لوگوں نے دل لگا کر اور نظر جما کر پڑھا ہے وہ اس کی گواہی دیں گے۔ موازنہ میں انیس کے محاسن شاعری کے ذیل میں انھوں نے جو طویل اور مختصر مثالیں درج کی ہیں بعد کے اکثر لکھنے والے ان پر بہت کم

اضافہ کرسکے ہیں۔اور بہتوں نے تو انہی کی تکرار کی ہے۔ اب تک انصاف کے ساتھ اس کا اعتراف نہیں کیا گیا کہ خالص شاعرانہ حیثیت سے انیس کے کلام وکمال کی جوشہرت ہے اس میں شبلی کی تصنیف موازنہ انیس ودبیر کا کتنا حصہ ہے۔
میر انیس کے کمال شاعری کے قائل سب ہیں، لیکن بہت کم لوگوں نے مراثی انیس کی جلدیں پڑھی ہوں گی، اگر یہ کہا جائے کہ اس قبول عام میں شبلی کی اس تصنیف کا بہت بڑا حصہ ہے تو اس میں مبالغہ نہیں ہوگا''۔(ایضاص ۶)

اس اعتراف کمال کے بعد رشید حسن خاں نے شبلی کی زندگی کا مرقع پیش کیا ہے، انتہائی اختصار کے ساتھ نام، بچپن کا نام اور تاریخ پیدائش مئی ۱۸۵۷ء۔ وفات ۱۹۱۴ء، تحصیل علم، علی گڑھ کی ملازمت، سرسید سے استفادہ، جدید تحقیقات سے آگاہی، وغیرہ حالات وواقعات اور بعض افکار مثلاً وہ جدید کی اہمیت کے قائل تھے مگر سرسید کی مذہبی اور سیاسی فکر سے اختلاف رکھتے تھے۔اور آخری بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ ان کی قدیم وجدید کی آویزش سے قدیم وجدید دونوں طبقے خوش نہیں رہے اور ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ اسی آویزش کی کہانی ہے۔

شبلی کی زندگی کے اس حصہ کو بیان کرنے میں رشید حسن خاں نے بڑے اختصار سے کام لیا ہے، سبب جو بھی رہا ہو مگر یہاں وہ اپنے بلند معیار تحقیق سے فروتر ہوکر گذر گئے ہیں، یہاں تک کہ شبلی کی تاریخ پیدائش جو حیات شبلی میں لکھی ہے اسی کو نقل کردیا ہے حالانکہ اس پر اس سے پہلے بحث وتحقیق ہوکر یہ طے ہو چکا تھا کہ شبلی کی تاریخ پیدائش مئی ۱۸۵۷ء نہیں بلکہ ۴؍جون ۱۸۵۷ء ہے۔اور اب یہ تحقیق بھی پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کی تحقیق سے کالعدم ہوکر ۴؍جون ۱۸۵۷ء ثابت ہو چکی ہے، خاں صاحب ذرا توجہ دیتے تو شاید کوئی تحقیق سامنے آتی۔

انتخاب مضامین شبلی میں وہ شبلی کی انشاء پردازی کی داد دے چکے ہیں مگر اس میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر ان کے ہم عصروں سے موازنہ بھی کرتے ہیں اور ان پر شبلی کی برتری ثابت کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''انشاء پرداز کی حیثیت سے شبلی کا مرتبہ اپنے معاصرین میں نہایت ممتاز ہے، ان کے یہاں نہ تو وہ سادگی ہے جس پر ''ابالی کھچڑی'' کی پھبتی کسی جاسکی اور نہ وہ رنگینی ہے جو تاریخ کو افسانہ بنادیا کرتی ہے۔ان کی عبارت میں ان کی شخصیت کی طرح پرشکوہ، بلند آہنگی اور پروقار دلکشی ہے۔یہ زبان علمی زبان ہے، لیکن شگفتگی آمیز ہے''۔(ایضا ص ۷)

رشید حسن خاں موازنہ کے بڑے مداح ہیں، خاص طور پر اس کے تنقیدی مباحث کے، اسے وہ ایک منفرد کتاب بتاتے ہیں اور اس کی کئی تنقیدی بحثوں کو تنقید کی بنیاد قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ شبلی انتہائی صفائی کے ساتھ یہ اقرار کرتے ہیں کہ میر انیس کے مقابلہ میں مرزا دبیر کا نام لینا گویا بدمذاقی ہے، پھر وہ لکھتے ہیں:

''اس کتاب کا بڑا حصہ موازنے کے بجائے میر انیس کے کمال شاعری کا مرقع ہے جس زمانے میں یہ کتاب شائع ہوئی تھی اس زمانے میں اس کی مخالفت کا خاصا زور وشور رہا تھا اور الزام یہی تھا کہ شبلی نے انصاف سے کام نہیں لیا ہے، اس کی رد میں کئی کتابیں لکھی گئیں، آج وہ کتابیں خاص خاص کتاب خانوں کے سوا اور کہیں نہیں دکھائی

دیتیں۔زمانہ سب سے بڑا منصف ہے''۔(ایضا ص ۷۔۸)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف شبلی کے ہم نوا ہیں بلکہ ان کے پرستار بھی ہیں، مخالفت میں لکھی جانے والی کتابوں کا ذکر بھی وہ بڑے سرسری انداز میں کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اس سلسلہ میں شبلی پر عائد اعتراضات سے بھی بحث کرتے ہیں اور پھر مدلل مداحی کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

''یہ صحیح نہیں ہے کہ اس کتاب میں دبیر کا تذکرہ انیس کے مقابلے میں کم، بہت کم ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ دبیر کو بالکل نظرانداز کردیا گیا ہو، یا دونوں کی شاعری کا موازنہ نہ کیا گیا ہو یا دبیر کے کمال کا مطلق اعتراف نہ کیا گیا ہو، شبلی نے کئی جگہ دبیر کی علمیت، قوت تخیل اور مضمون آفرینی کا ذکر کیا ہے۔تشبیہات واستعارات کی جدت کا بھی تذکرہ کیا ہے، مثالیں بھی دی ہیں''۔(ایضا ص ۸)

''ظاہر یہ ذرا سخت رویہ معلوم ہوتا ہے لیکن اگر دبیر کے مراثی کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تب شبلی کی اس رائے کی صداقت کا صحیح اندازہ ہوگا۔ عام طور سے اظہار ہمدردی بر بنائے روایات کیا جاتا ہے۔محض اس مفروضے کی بنا پر کہ شبلی نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے اور ایسے حضرات میں اکثر نے کلام دبیر کا مطالعہ ذرا کم ہی کیا ہوتا ہے، دبیر کے مرثیے پڑھنے کے بعد شبلی کی سخن فہمی وسخن سنجی پر ایمان لانا پڑے گا''۔ (ایضا ص ۸)

عظمت شبلی کے یہ اعترافات اگر ایک عام نقاد کے قلم سے ہوتے تو شاید اس قدر دلچسپی نہ پیدا کرتے چونکہ یہ اپنے عہد کے سب سے بڑے محقق اور صاحب نظر نقاد کے قلم سے ہیں اس لئے قابل ذکر ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ واقعی موازنہ انیس ودبیر ہمارے کلاسیکل ادب کا بہترین سرمایہ ہے۔

اسیر ادروی

مولانا نظام الدین اسیر ادروی (پ: ۱۹۲۶ء) معروف اہل قلم اور نامور مصنف ہیں۔دو درجن سے زاید علمی، تاریخی، سوانحی اور مذہبی کتابیں ان کے قلم سے نکل کر مقبول ہوچکی ہیں۔وہ عرصہ تک جامعہ اسلامیہ میں استاذ اور سہ ماہی مجلّہ ترجمان الاسلام بنارس کے مدیر رہے، وہ بھی علامہ شبلی کے بڑے شیدائی ہیں۔انھوں نے ڈاکٹر انیس ادیب (۱۹۳۴۔۲۰۱۷ء) کے مجموعہ مضامین ''نقوش صد رنگ'' پر ایک مختصر سی تقریظ لکھی ہے اور انیس ادیب صاحب کے ایک مضمون مولانا شبلی نعمانی کی فارسی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہم آج ان کے مقالہ کے اس حصہ کو پیش کررہے ہیں جو شبلی نعمانی کی فارسی شاعری سے متعلق ہے، انھوں نے بالکل صحیح کہا ہے کہ شبلی نعمانی دراصل اردو کے نہیں فارسی کے شاعر تھے۔ ان کے جوہر فارسی میں کھلے، راقم الحروف کو موصوف کی اس صداقت سے حرف بہ حرف اتفاق ہے۔ان کی فارسی غزلوں کو پڑھئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ حافظ شیرازی باوۂ شیراز کا چھلکتا ہوا جام ہاتھوں میں لئے کھڑے ہیں، وہی سرمستی، وہی شوخی، وہی انداز لب ولہجہ جو زندگی کو کیف وسرور سے بھر دے''۔(نقوش صد رنگ، ڈاکٹر انیس ادیب، ص ۸، مئو، ۲۰۱۱ء)

مولانا صدرالدین اصلاحی (حیدرآباد)

ایمان بالآخرت

ظاہر ہے کہ یہ سوچنا کوئی سوچنا نہیں بلکہ ایک فریب مصلحت ہے جو فطرتِ انسانی کی اندرونی خلش کو دبانے کے لیے عیشِ دنیا کا پرستار اور مادّی مفاد کا دلدادہ نفس اختیار کرتا ہے۔ اس طرح در اصل وہ دونوں متضاد میلانوں میں مصلحت کرانا چاہتا ہے۔ پھر یہ مصالحت بھی بڑی ہی عجیب وغریب کی طرح مصالحت ہوتی ہے، اس میں عام دستورِ مصالحت کے خلاف صرف ایک ہی فریق کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑتی ہے اور فریق ثانی اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں کھسکتا۔ قیامت اور محاسبۂ اعمال کے فطری احساس کو جب یہ کہہ کر تھپکیاں دی جائیں گی کہ تمہارا وجود بالکل برحق ہے، مگر اسی کے ساتھ یہ بات برحق ہے کہ انسان کی دنیوی خوشحالی دراصل آخرت کی خوشحالی کی سند ہے تو اس اقرار قیامت کی سرحدیں انکار کی سرحدوں سے حقیقتاً کتنی دور ہوں گی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس دام فریب کے تار کچھ اتنے مضبوط نہیں ہیں کہ احساس فطرت کی اضطرابی کیفیتیں انہیں توڑ نہ سکیں، اس لیے نفسانیت زدہ عقل نے ایک اور جال بُن کر فراہم کیا۔ اس نے کہا قیامت کے انکار پر اصرار کی ضرورت نہیں۔ مان لو کہ وہ آ ہی جائے گی، مگر اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی تمہارے لیے سکینتِ خاطر کا موجب ہونی چاہئے کہ انسان کی مغفرت اس کے اپنے اعمال کے پیش نظر نہ ہوگی بلکہ دراصل ان بلند مرتبت ہستیوں کی سفارش پر ہوگی، جن کو معاملات قدرت میں درخور (مداخلت) حاصل ہے۔ خواہ براہ راست حقوق کار فرمائی میں شریک ہونے کی حیثیت سے، خواہ بارگاہِ رب میں ایسا مقرب ہونے کی حیثیت سے جس کی بات ٹالی نہ جاسکے۔ اب تمہارا کام صرف یہ ہے کہ ان بہت ساری ہستیوں میں کسی ایک کا دامن پکڑ لو، اس کی تعریفیں کرو، اس کی عقیدتوں کے گیت گاؤ، اس کے استھان یا اس کے مزار پر والہانہ انداز میں سجدے کرو، اس کے تقدس کے احترام کی قسمیں کھاؤ، اسے خاص خاص اوقات میں نذریں چڑھاؤ، اس کے حضور اپنی التجائیں پیش کرو، پھر اس کے بعد تم آزاد ہو کر زندگی میں جو چاہو کرو، اب دنیا اور دین دونوں کی سعادت مندیاں تمہارے لیے بالکل یقینی ہیں۔ مشرکینِ عرب، جن کے انکار قیامت کی شدت کا حال کسی پر مخفی نہیں، اس انکار کے ساتھ یہ بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَـآؤُنَا عِندَ اللّٰهِ (یونس ۱۸) یہ (سارے معبود دراصل) اللہ کے حضور ہمارے شفارشی ہیں"۔

"اللہ کے حضور سفارشی" کے الفاظ بتاتے ہیں کہ دل کی گہرائیوں میں آخرت کی باز پرس کا اندیشہ بہرحال کھٹک رہا ہے اور خودساختہ معبودوں کی پرستش اور بندگی اختیار کرنے کی اہم ترین وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے زور اور رسوخ سے لوگوں کو لازماً بخشوا دیں گے۔

اعتراف کرنا چاہئے کہ نفس کا یہ داؤ پہلے داؤ سے زیادہ کارگر ہے اور اس کے دام فریب کے تار اتنے بودے نہیں ہیں کہ عقل وفطرت کا کوئی کمزور احساس انہیں آسانی سے توڑ سکے۔ فرشتوں، نبیوں، ولیوں اور بزرگ انسانوں کے ساتھ عقیدت کی جڑیں دلوں میں بڑی گہری اُتری ہوئی ہوتی ہیں، بسا اوقات اتنی گہری کہ اگر آپ توحید خالص کا نظریہ لوگوں کے سامنے پیش کریں اور انہیں بتائیں کہ یہ سارے کے سارے اللہ کے سامنے بندۂ مجبور ہیں، یہ کوئی خاص طاقت نہیں رکھتے، ان کی شفاعت کسی شخص کو ہرگز نہ بچا سکے گی جو اللہ تعالیٰ کے قانون عدل کے مطابق سزا کا

مستوجب ہوگا۔ اور حق تو یہ ہے کہ وہ ایسے کسی شخص کی شفاعت کریں گے ہی نہیں اور نہ کر ہی سکیں گے، تو آپ کی یہ ساری باتیں ان کے نزدیک بداعتقادی، گستاخی اور بے دینی پر محمول ہوں گی۔ ان کے نقطۂ خیال کے مطابق آپ ایسا کہہ مقربین خدا کی توہین کے مرتکب ہوں گے اور یہ ان کی ''دینداری'' کا شدید ترین تقاضہ ہوگا کہ آپ کی باتوں کو ٹھکرا دیں، ان کی مخالفت کریں اور ان پر نفرتیں بھیجیں اور ان کی ناپاک بھنک سے بھی اپنے کانوں کو محفوظ رکھیں، اگر کبھی آپ کو ایسی ذہنیتوں سے سابقہ پڑا ہوگا تو آپ جانتے ہوں گے کہ نفسیاتی طور پر یہ معاملہ کتنا نازک بن جاتا ہے اور ایسے مواقع پر مشرکوں کے جذبات کس طرح بھڑک اٹھتے ہیں۔ ان کے بھڑکنے کا انداز کچھ ایسا ظاہر فریب ہوتا ہے کہ گویا یہ سچی دینداری اور پختہ عقیدگی ہے جو انہیں جلال حق سے بیتاب کر رہی ہے اور بدعقیدگی کے خلاف اشتعال دلا رہی ہے۔ مگر دراصل صورت معاملہ کچھ اور ہی ہوتی ہے اور حمایت ''حق'' کی اس سطح کے اندر، گہرائیوں میں، جو حقیقت موجود ہوتی ہے، اس کا انہیں غالباً بسا اوقات خود بھی شعور نہیں ہوتا، کیونکہ وہ غلط فہمیوں، خوش گمانیوں، زود (گھڑے) اعتقادیوں اور جہل کی تراشی ہوئی تاویلوں کے بوجھ سے دب جاتی اور شعور سے نکل کر لاشعور میں جا چھپی ہوتی ہے۔ اصل مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ بندگی کی ہمہ گیر ذمہ داریوں سے بچا جائے اور مفاد دنیا کی پوجا میں کہیں سے رخنہ اندازی نہ ہونے پائے لیکن نام لیا جاتا ہے مقربین بارگارہ کی عظمت واحترام کا، چونکہ ایسے لوگ بے قید زندگی بسر کرنے کے حریص ہوتے ہیں اور اس مقصد کے حصول میں قیامت اور جزائے عمل کا اندیشہ ایک ایسا زبردست روک ثابت ہوتا ہے کہ لاکھ کوششوں کے باوجود اس اندیشہ سے ذہن خالی نہیں ہو سکتا، اس لیے اسے افیون کا انجکشن دے کر عقل ماؤف کردینے کی یہ کامیاب کوشش کی گئی، یعنی اسے باور کرایا گیا کہ فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں، ان بزرگ ہستیوں کی موجودگی میں سزا اور تعزیر کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوگا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا یہ فریب مصالحت پہلے سے زیادہ مؤثر اور زوردار ثابت ہوا۔ دراصل اس میں جو نفسیاتی نزاکتیں ہیں، ان کے ہوتے ہوئے اسے زیادہ مؤثر اور زور دار ہونا ہی چاہیئے تھا اور اگر انسان کے عقلی اور فطری احساسات اس کے اسیر بن جائیں، تو یہ چنداں قابل حیرت نہیں، چنانچہ دنیا کی اکثریت بالعموم اسی دام کا نخچیر بنتی جا رہی ہے اور شاید آج بھی ہے۔

یہ تو ان لوگوں کا ''سوچنا'' تھا جو علانیہ منکرینِ قیامت ہوتے ہیں، یا رہے ہیں، اب ذرا اُن لوگوں کے سوچ بچارہ کا بھی جائزہ لے لینا چاہیئے، جو ایمان بالآخرت کے مدعی ہوتے ہیں، لیکن ساتھ ہی گردن دنیا پرستی کے عفریت کے چنگل میں دبی ہوتی ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ یہ لوگ اپنی مشکل کا حل کیا نکالتے ہیں اور ان دونوں متصلوں حقیقتوں میں مصالحت کی کیا صورت پیدا کرتے ہیں، اس ضمن میں یہ بات پہلے ہی سے مان لینی چاہیئے کہ مصالحت کی نوعیت اور اس کی اصل جان اس گروہ کے ہاں بھی بعینہ وہی ہوگی جو پہلے گروہ کے یہاں ہے اور اس کا مقصود اس کے یہاں بھی صرف یہی ہوگا کہ عملاً فکر وایمانِ آخرت کو معطل کر دیا جائے اور ہرگز اس کا کوئی دباؤ اپنے طرز فکر اور طریق عمل پر نہ پڑنے دیا جائے۔ یہاں تک کہ نفس کی بے لگام خواہشوں کو کھلی چھوٹ مل جائے۔ حالات کا جائزہ لیئے بغیر پہلے ہی سے اس قسم کی رائے قائم کر لینا نہ تو کوئی عملی غلطی ہے، نہ ہی اس گروہ کے حق میں کوئی ناانصافی، اس لیے اگر انسان کے اندر اتباع شہوات کا ہوکا نہ اٹھے تو مصالحت کی نامبارک سعی کی اسے ضرورہی نہ ہوگی، اور جب تک اس اتباع شہوات میں اس کا نفس اس کی کوششوں پر اظہار اطمینان نہ کردے اس وقت تک وہ اپنے قدموں کو روک نہیں سکتا اور یہ کوئی راز نہیں ہے، کہ نفس کو اطمینان کب ہوتا ہے، آیا اس وقت جب کہ فکرِ آخرت، فکرِ دنیا پر غالب رہتی ہے، یا اس وقت جب کہ اس سے پوری طرح مغلوب ہو چکی ہوتی ہے؟۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی (کشمیر)

سمندر ہے درمیاں ....فکر وخیال کا جمال احساس شعری امتزاج

دل مضطرب ہے، آنکھ ہے نم، کیا کہے زبان
کچھ مشکلیں ہیں اور سمندر ہے درمیاں

شعری مجموعہ ''سمندر ہے درمیاں'' (ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی...مصر) کی نظموں کی قرأت کے بعد جو تاثرات ذہن میں ابھرتے ہیں، ان کو اگر مختصر لفظوں میں پیش کریں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ نظمیں واقعی نم آنکھوں اور دلِ مضطرب کا تخلیقی اظہار ہے اور زندگی کے سمندر کی تلخ وشیریں یادوں کا بیان 'کہنے' کی بجائے لفظ ومعنی کے حسین و دلکش شعری پیکر میں پیش ہوا ہے۔ شاعری میں دل کی دھڑکن بھی ہوتی ہے اور دماغ کی ریاضت بھی۔ کسی بھی حساس شاعر کا دماغ جب دل کی بے قراری سے مضطرب ہوجاتا ہے تو اس کے احساسات وجذبات تخلیقی مرصع سازی کی فنی صنعت گری سے شعری پیکر میں ڈھل جاتے ہیں اور پھر یہ کلام اپنی جمالیاتی اثر انگیزی سے جمال احساس قاری کے دماغ کو بھی مسحور کرجاتا ہے۔ اس طرح سے فکر وسوچ کے اس عمل کا تخلیقی رشتہ انسان کی نفسیات سے جڑ جاتا ہے اور پھر شاعر کے نزدیک دل کی دھڑکن اور ڈھول کی تھاپ ایک ہی بن جاتی ہے۔ اس دھڑکن کی بے قراری اور تھاپ کی آواز پر کون اپنے جذبات کو قابو میں رکھ سکتا ہے، جیسا کہ پیش نظر کتاب کی نظم ''دل دھڑکتا ہے'' کا یہ حصہ دیکھیں:

دل دھڑکتا ہے
دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے
دل کی دھڑکن اور ڈھول کی تھاپ ایک ہی ہے
اس پر کوئی اختیار نہیں
اسے روکنے کی کوشش
ایک ناکام کوشش
یہ دھڑکن اشد متاثر کرتی ہے
میری زندگی پر حاوی ہوتی ہے

دراصل دل کی دھڑکن کا زیر وبم ہی جب دماغ کے تاروں کو چھیڑتا ہے تو ایک جینوئن تخلیق کار کا تخلیقی ساز ازخود بج اٹھتا ہے اور پھر اس ساز کے مختلف سُر شعر وفکشن کے لفظی پیکر کے مختلف رنگوں میں سامنے آتے ہیں، جس کو ہم فنی تخلیقیت (Creative art) بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ:

''On the text of life, art is the highlighter''

(زندگی کے متن (کتاب) میں فن ایک نمایاں پیش کار کی حیثیت رکھتا ہے۔)

لفظی پیکر کے ان مختلف رنگوں کا کینوس زندگی کے متنوع پہلوؤں پر پھیلا ہوتا ہے اور تخلیق کار حسبِ ذوق اپنی تخلیقات کو اس کینوس کی مختلف جہات کی تخیلی رنگ آمیزی سے بھر دیتا ہے۔ لیکن یہ کسی منصوبہ بند ارادے سے نہیں ہوتا ہے بلکہ اکثر جب کسی تخلیق کار کی فکر کسی تجربے یا مشاہدے سے متاثر ہوجاتی ہے تو پھر اس کی تخلیق بھی اسی قسم کے رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ اس تناظر میں دیکھیں تو پیش نظر مجموعہ کی تخلیق کار کی سوچ وفکر اور خیال آفرینی کے متنوع تخلیقی رنگ ''سمندر ہے درمیاں'' میں شوخ انداز سے سامنے آتے ہیں۔ ان تخلیقی رنگوں میں ''عشق

کا جنون" بھی ہے اور "تاریک رات" کے سیاہ بھیڑیوں کا ڈر بھی ۔ایک "جادوگر" کی دلفریب جادوگری بھی ہے کہ جس کے جادو میں دل کے مرض کی دوا بھی اور جس کو پانے کی حیات کو تمنا بھی ہے۔"ہمکلام ہوں خود سے" کا وجودی کرب اور "خوابوں کی دنیا" کا رجائی احساس بھی ہے۔ "مجھے ایک عورت ہونے پر ناز ہے" جیسا فخر احساس پیام بھی اور "محبت کا لبادہ زنجیر سے زیادہ" کی تلخ وشیریں یادوں کا ہجوم بھی ہے۔عصری کرب کی ہولناک صورتیں "ہولناکی ہمارے عہد کی" اور "معصوم انسانوں کا خون" کے خونین سیلاب کا غم بھی ہے۔ "محبت کے نشے میں" سیلاب عشق کی لہریں بھی ہیں اور "عشق کا دبیز پردہ" میں غم عشق میں سسکتی گھٹن زدہ زندگی بھی ہے۔ "اے قدس" میں بیت المقدس پر تاریخی نوعیت کی غم انگیز نوحہ خوانی بھی ہے اور "غلام کی روح" کا کرب ریز خیال بھی ہے' موضوعات اور احساسات کا فینٹسی نما خیال "سمندر ہے درمیاں" بھی ہے' جس میں خیالات کی کشتی سمندر کی فینٹسی میں اسقدر ڈولتی رہتی ہے کہ ڈوبنے کا خطرہ ہونے کے باوجود خوابوں کی ایک حسین دنیا سجانے کی تمنا بھی ہے۔

شامل کتاب مذکورہ نظموں کے فنی اظہار اور موضوعاتی پیش کش پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے' تاہم زیر نظر مضمون میں چند ہی نظموں پر ارتکاز کیا جائے گا۔کسی بھی خطہ کی سیاسی یا سماجی صورتحال کو زیادہ تر اسی خطے سے تعلق رکھنے والا تخلیق کار بہتر اور موثر انداز سے تخلیق کا حصہ بنا سکتا ہے' جیسے کشمیر یا فلسطین' عراق یا افغانستان وغیرہ جگہوں سے تعلق رکھنے والے قلمکاروں کی تحریر میں موضوعاتی سطح پر جو تخلیقی اصلیت (Creative Originalit) کا لمس موجود ہوگا وہ شاید اس قلمکار کی تحریر' جو اس نے ان جگہوں سے متعلق لکھی ہو' میں نظر نہیں آئے گا جو کسی اور جگہ کا رہنے والا ہوا اور ہاں کبھی کبھی مشاہدہ' مطالعہ یا تجربہ کی بناء پر کوئی دوسرے خطے کا قلمکار بھی کسی بھی موضوع کو بہتر ڈھنگ سے فنی قالب میں ڈال سکتا ہے' نہیں تو عام طور جب کسی کی تحریر میں کسی غیر جگہ یا علاقے کو موضوع بنایا گیا ہو تو اس میں زیادہ تر موضوعاتی سطحیت (Content Shallowness) کا نظر آنا فطری تجربہ ہے۔پیش نظر مجموعہ کی ایک نظم "اے قدس" میں ارض قدس کے تاریخی جبر اور جابرانہ قبضہ سے اسے چھڑانے اور مسلم امہ خصوصاً عربوں کی غفلت شعاری اور ان کی شرمناک مصلحت پسندی کو دل گیر اسلوب میں موضوع گفتگو بنایا گیا ہے کہ کس طرح عرب کے لوگ اپنی خودداری اور شجاعت کو نیلام کر کے ارض قدس کی بازیابی کے حق سے دستبردار ہو گئے اور ان کے دل کس قدر سرد پڑ گئے ہیں۔مسئلہ فلسطین یا ارض قدس اگرچہ اقوام عالم کے لئے گلے کی ہڈی بنا ہوا ہے' تاہم طاقت کے نشے میں چور عیسائی اور یہودی اسے دینی' تہذیبی اور سیاسی فتح سمجھتے ہیں نہ کہ کوئی انسانی مسئلہ۔بقول علامہ اقبال:

جلتا ہے مگر شام و فلسطین پہ میرا دل
تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار

اور واقعی مسئلہ فلسطین کے کرب پر ایک باشعور اور انسانیت پرست انسان کا دل صرف جلتا ہی رہے گا کیونکہ انسانیت کے سودا گروں نے اس مسئلہ کے عقدے کو اتنا دشوار بنا دیا ہے کہ کچھ سمجھ نہیں آتا ہے کہ اس کا حل کب نکلے گا۔چونکہ نظم کی تخلیق کار خود بھی اسی تہذیب اور ماحول کی پروردہ ہے' اس لئے اس نظم میں تخلیقی طور پر موضوعاتی اصلیت کی عمدہ پیش کش نظر آتی ہے۔شاعرہ صرف قدس کی حالت زار کا بیان نہیں کر رہی ہے بلکہ خود کو اس حالت زار کا حصہ بن کر ملائم لہجے میں احتجاج کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

اے قدس! دل میرا لرزتا ہے دکھ سے
اے قدس! تو غاصبوں کے ہاتھ مانندِ گل بے خار آگئی ہے

اے قدس! تو غاصبوں کے پاس مانندِ شہد آ گئی بنا ڈستی مکھیوں کے
عربوں نے محض نعروں پر ہی اکتفا کیا
ایسا لگتا ہے کہ وہ فقط خواب ہی دیکھتے ہیں ایک پُرامن حل کا
جس پر غاصب نے غلبہ کیا زورِ تلوار سے
کیا واپس لوٹ آئے گا ایک کاغذی خط سے

شعر و فکشن میں معاصر حسیت (Contemporary sensiblity) کا تخلیقی امتزاج نئی تازگی کا ضامن ہوتا ہے' کیونکہ اسی سے کسی بھی تخلیق کار کی تخلیقی زرخیزی کا پتہ چلتا ہے۔ اب معاصر حسیت کو تخلیق کے قالب میں پیش کرنے کے کئی فنی اسالیب ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک' کسی بھی خارجی مسئلے یا موضوع کو داخلی یا وجودی کرب کا حصہ بنا کر تخلیق کا حصہ بنانا ہوتا ہے۔ اور پھر اس موضوع کو ''سرحد ادارک'' پر ظاہر کر کے سپرد تخلیق کیا جاتا ہے۔ اس میں بیان کرنے کی ایک تکنیک خودکلامی کی تکنیک بھی ہوتی ہے۔ کتاب کی ایک نظم ''ہمکلام ہوں خود سے'' میں بھی خارجی مسائل کے دکھ بھرے اظہار کو داخلی یا وجودی کرب کا حصہ بنایا گیا ہے اور نظم میں تخلیق کار ایک بیان کنندہ کی صورت میں خود سے ہم کلام ہو کر حیرت کے عالم میں استفہامیہ انداز سے پوچھتی ہیں کہ انسان پر شیطان کا غلبہ اتنا کیوں ہوا ہے کہ دنیا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی ہے۔ کیوں انسان حیوان بن کر انسانوں کا خون بہا رہا ہے۔ عبادت گاہوں میں بھی خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ ہمیں اس تکلیف سے کب نجات ملے گی۔ کب تمام مذاہب کو قریب لایا جائے گا:

ہمکلام ہوں خود سے
محو حیرت ہوں' پوچھتی ہوں' سوچھتی ہوں
کیونکر اتنی تکلیفیں سہنی پڑتی ہیں ہمیں
جس کے سبب
دنیا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے
انساں پہ شیطاں کا اثر اتنا زیادہ کیوں ہے مولا؟
برسوں سے کیوں خون ہے جاری

چونکہ غزل' رباعی یا مثنوی وغیرہ شعری اصناف کے برعکس اردو نظم کی جدید صورت انگریزی یا چند دوسری اہم زبانوں کی نظموں کی طرح کسی مخصوص ہیئتی نظام کی پابند نہیں رہی ہے' بلکہ اس میں بنیادی اہمیت تخلیقی رچاؤ اور شعری اسلوب کو ہوتی ہے تو اس تناظر میں اس مجموعہ کی کئی نظمیں اپنا شعری اختصاص برقرار رکھنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ البتہ چند نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں تخلیقی صنعت گری کے متاثر کن تجربے کے برعکس سطحی قسم کے خیالات کا منثورانہ اظہار اور احساسات و جذبات کی روایتی پیش کش یا خیالات کی تکرار ہی نظر آتی ہے ۔جیسے ''خوابوں کی دنیا'' ''عشق کیا ہے'' ''وہ ہماری قسمت'' ''میری یادیں اس دنیا کی نہیں'' ''ایک ایسا رشتہ'' وغیرہ۔

مجموعی طور پر دیکھیں تو شعری مجموعہ ''سمندر ہے درمیاں'' کی کئی نظمیں فکر و فن کا جمال احساس شعری امتزاج معلوم ہوتی ہیں' کیونکہ ان میں فنی طور پر فکر و خیال کو اثر انگیز اسلوب (Imprssive style) کے توسط سے شعری پیکر میں ڈھالا گیا ہے۔ یہاں پر اس بات کو بھی دہرانا مناسب رہے گا کہ کتاب ''سمندر ہے درمیاں'' کی مصنفہ ''ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی'' کی مادری زبان عربی ہے اور عین شمس یونیورسٹی قاہرہ مصر کے شعبۂ اردو میں ایسیوسیٹ پروفیسر ہیں۔ یہ اردو اور عربی دونوں زبانوں میں لکھتی ہیں جو کہ ان کی لسانی اور تحریری صلاحیت کا قابل ستائش پہلو ہے۔ اردو زبان سے محبت کے تعلق سے پیش لفظ میں لکھتی ہیں:

''مجھے اردو زبان سے بہت لگاؤ ہے۔ اس سے مجھے عشق ہے۔ اس عشق نے جس کتاب کو جنم دیا۔۔۔۔ میں اردو کے تہذیبی ورثے سے شغف رکھتی ہوں۔ اردو زبان و ثقافتی یا تاریخی اعتبار سے بہت عظیم زبان ہے۔ سارے جہاں میں دھوم اردو کی ہے جو کہ ایک عالمی زبان ہے۔'' (کتاب: سمندر ہے درمیاں۔ ص:۴۱)

نواز احمد (ریسرچ اسکالر ای۔ایف۔ایل یونیورسٹی، حیدرآباد)

نجیب محفوظ: ایک عہد ساز شخصیت

مصر کی سرزمین ادب عربی کے حوالے سے واقعی بڑی زرخیز وشاداب ثابت ہوئی ہے، یہاں بڑے بڑے عباقرہ فن، اجلہ علم وادباء وفصحاء پیدا ہوئے انہی میں سے ایک نام نجیب محفوظ کا بھی ہے، جی وہ نجیب محفوظ کہ شیخ طنطاوی نے جسے عالمی اثاثہ اور سرمایہ کہا، فرمایا یہ ان میں سے ہے جن کے لازوال کارناموں پر فخر کیا جانا حق ہے، انہوں نے مزید کہا کہ یہ وہ ہیں جنہوں نے ادب عربی کو مقامی سطح سے اس طاقت کے ساتھ اٹھایا کہ وہ افق عالم پر روشن ہوگیا، جی وہی نجیب محفوظ جس نے ادب عربی کی پرواز کو رفتار دی، اوراس سرعت سے اس کی بلندیوں میں اضافہ کیا کہ زمانہ عش عش کرتا رہ گیا۔

یہ 1912 کا سال تھا جب قاہرہ کے جمالیہ نامی بستی کے ایک متوسط گھرانے میں نجیب محفوظ نے آنکھیں کھولیں، لوگ اسے صابر کے نام سے پکارنے لگے، رفتہ رفتہ یہ بچہ طفولیت سے لڑکپن اور جوانی کی منازل طے کرنے لگا، دستور کے مطابق تعلیمی مشاغل یکے بعد دیگرے شروع کئے، پہلے ابتدائیہ، پھر ثانویہ کی تعلیم مکمل ہوئی، سلسلہ آگے بڑھا یہ نوجوان قاہرہ یونیورسٹی کے شعبہ ادب میں داخل ہوگیا، محنت، لگن اور تڑپ سے نئی فضائیں ہموار ہونے لگیں، شعبہ فلسفہ سے بیچلر کی ڈگری حاصل کی، دل کی تسکین نہ ہوئی تو اگلی تعلیم کے لئے ایم اے میں داخلہ لیا، لیکن زندگی کے کچھ اتار چڑھاؤ راہ میں حائل ہوگئے، ملازمت کی احتیاج، اور اپنے ادبی ذوق کے نکھار وکمال کے جذبات نے بھی سد سکندری کا کام کیا اور وہ اگلی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔

نجیب محفوظ نے بہت سی سرکاری ملازمتیں کیں، کئی عہدوں پر تعینات کیے گئے، آخر میں وہ ڈائریکٹر بورڈ فارسینما کی صدارت کررہے تھے کہ انہیں مشیر برائے وزارت ثقافت پر براجمان کردیا گیا، انکی ادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے انہیں 1988 میں نوبل پرائز بھی دیا گیا، وہ پہلے ایسے ادیب تھے جنہیں ادب عربی میں اتنے بڑے انعام کا حقدار سمجھا گیا، اس سے قبل مقامی سطح پر بھی وہ بہت سے ایوارڈ لے چکے تھے، انہی میں سے 1970 کا ریاستی سطح کا ایوارڈ بھی قابل ذکر ہے، جو ادب عربی کی خدمت کے لئے ہی دیا گیا تھا

نجیب محفوظ نے صحافت کو اپنی پیشہ وارانہ زندگی کے لئے منتخب فرمایا اور مجلہ اہرام میں مضامین، تجزیے اور رپورٹنگ لکھنے لگے، نجیب محفوظ کی عبقری شخصیت صرف چند مضامین لکھ کر اس کی اشاعت پر کہاں قانع ہوسکتی تھی چنانچہ انہوں نے ترجمہ نگاری کو اپنی ادبی وفنی ذوق کا یاور پایا اوراس پر اپنی محبتوں اور وارفتگی کے خم لنڈھانے لگے مصر القدیمہ، اسی زمانے کی برکتوں کا نتیجہ ہے اسی دور میں انہوں نے بیشتر تاریخی ناول کو بھی عربی ادب میں منتقل کیا۔

ان تمام مصروفیات کے باوجود نجیب محفوظ معاشرے کے سلگتے مسائل پر بھی خوب لکھا، جسکا اندازہ اہم درج ذیل کتابوں کی فہرست سے اندازہ لگا سکتے ہیں مصر القدیمہ ۱۹۳۶، عبث الاقدار ۱۹۳۹، همس الجنون ۱۹۳۸، رادوبیس ۱۹۴۳، وخان الخلیلی ۱۹۴۵، قاہرہ الجدیدہ ۱۹۴۵، وزقاق المدق ۱۹۴۷، وبدایہ ونہایہ ۱۹۵۰، اللص والکلاب ۱۹۶۱، والسمان والخریف ۱۹۶۲، والطریق ۱۹۶۴، و الشحاذ ۱۹۶۵، وثرثرة فوق النیل ۱۹۶۶، ومیرامار ۱۹۶۷، وغیرہ۔

ادبی سرگرمیاں

نجیب محفوظ غیر فطری طور پر بہت سے قلمکاروں اور مغربی ادباء کی آفاقی سرگرمیوں سے بہت متاثر تھا، ان میں فرانسیسی قصہ نگار..موبسان، سرفہرست تھا، انہی کو اپنا آئیڈیل مانتے ہوئے اس نے ادب عربی کے لئے بیشتر شاہکار تصانیف کا ورثہ چھوڑا، لگ بھگ پچاس ناول وافسانوں کا یہ گلدستہ آج عالمی لائبریریوں کی زینت ہیں، ادب کے طلباء جن کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں مجھے یہ کہنے میں کوئی باق نہیں کہ یہ نجیب ہی تھا جس نے ادب عربی کو عالمی سطح پر متعارف کروایا، ناول نجیب کا امتیاز تھا (بعض اہل تنقیداسے جدید ناول نگاری کا علمبرادار کہتے ہیں) اسی امتیازی وصف کا نتیجہ ثلاثیات کی شکل میں دنیا کے سامنے ظاہر ہوا۔

وفات

ہر عروج کو زوال ہے، ہر چمک کو ایک روز ماند ہونا ہوتا ہے، ہر دلکشی ویرانی میں تبدیل ہوتی ہے، بہاروں پر خزاوں کی حکمرانی کسی سے ڈھکی چھپی ہے، محلات کا مقدر ہی ویرانہ ہے، کروفر، جاہ وحشم، چیخ وپکار، ہاؤ کار، بجتے طبل، کھنکتی زنجیریں، نفیریوں کی آوازیں، ہٹو بچو کی صدائیں، سلاطین، حکام، شعراء، ادباء، حکماء وفلاسفہ صوفی وملا، کوئی اجل سے بچ نہ سکا، سب کو موت نے گھیرا، یہ نجیب کے ساتھ ہوا، ابھی تو اس شہسوار ادب نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تھی، ابھی تو پھونکوں سے ہواؤں میں تلاطم بپا ہوا تھا، ابھی تو ادب کی پلکیں، نین ونقش کی تزئین کاری کو یہ مصور بیٹھا تھا، فرصت کے لمحات ہی جب ابھی حاصل ہوئے تھے، پہلے تو غم روزگار کا گھیرا تھا، یار لوگ ہیں کہ پچانوے برس عمر ہو چکی تھی، اب کہاں وہ جولانی طبع کہ مضامین کی آمد ہوتی، میں کہتا ہوں نہیں ابھی تو صیقل ہوا تھا، اب لکھا ہوا ہر حرف ادب عربی کے لئے سند اور مثال تھا، لیکن تقدیر کو کون ٹال سکتا ہے، یہی نجیب کے ساتھ بھی ہوا کہ ساری امیدیں تمنائیں سینے میں دفن ہو کر رہ گئیں، ہارٹ اٹیک کا عارضہ ہوا، اور یکا یک ایک حساس قلمکار کا ظاہری حلیہ دنیا کی نظر سے اوجھل ہو گیا، اور یوں ادب عربی میں انکا بپا کیا ہوا تلاطم تھم سا گیا، اور اس سچائی کا بھی کوئی منکر نہیں کہ نجیب چلا گیا لیکن ادب ادب عربی کے حوالہ سے اسکی خدمات تاریخ کے تابندہ نقوش بن گئیں، اب ادب عربی کا اس وقت تک اتمام نہیں ہوتا جب تک نجیب کو پڑھا نہیں جاتا، یہ اسکے خلوص، محبت، وارفتگی، اور انتھک محنتوں کا ثمرہ ہے، نجیب عمر کی پچانویں بہاریں دیکھ چکے تھے، کہ ہارٹ اٹیک کے عارضہ ہوا اور یکا یک ایک حساس قلمکار کا ظاہری حلیہ دنیا کی نظر سے اوجھل ہو گیا، اور اپنے خالق حقیقی سے جاملا، اور یوں ادب عربی میں انکا بپا کیا ہوا تلاطم تھم سا گیا۔

نجیب محفوظ کا اسلوب وطرز نگارش

نجیب محفوظ کا قلم جب بھی کسی واقعہ منظر یا صورتحال کا جائزہ لیتا ہے، تو وہ قلم کی زبان نہیں بلکہ قلم کی آنکھ کا استعمال کرتا ہے وہ بھی ہر طرح دور بین وخورد بین کا استعمال کر کیا اور یوں جب وہ واقعہ، حادثہ یا صورتحال نجیب کے قلم مرتب ہو کر لوگوں تک پہنچتی تو انہیں الفاظ نہیں بلکہ فوٹو گرافی لگتی، وہ حقیقت کے انتہائی قریب جا کر لکھتا، عبارت سہل کہ سب سمجھیں، الفاظ سادہ کہ کوئی دشواری پیش نہ آئے، کتنے ہی سربستہ رازوں سے یہ بندہ مزاق ہی مزاق میں پردے اٹھا گیا، ان کی ناول نگاری میں آپ کثرت سے عشقیہ کہانیاں دیکھیں گےآپ کو مرد وزن کی تانک جھانک، آنکھ مچولی، ایک نظر دیکھنے کو بیتابی ووارفتگی، ملاپ، جدائیاں، حسن، جمال، سب پڑھنے کو ملے گا، نجیب نے جہاں حسن وعشق کی داستانیں رقم کی ہیں وہیں وہ خاندانوں میں، رشتوں میں چپقلش رسہ کشی اور نوک جھونک کو کچھ اسطور بیان کرتا ہے کہ گھر گھر کی کہانی لگتی ہے، پانی، منڈیر، صحن، پڑوس، پر برپا ہونے والی سرد جنگوں کا کچھ اس خوبی سے تذکرہ کرتا ہے کہ پڑھنے والا داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا، نجیب نے سیاست کو باقاعدہ وقت نہیں دیا، نہ اسکے شور وغل اور اتار چڑھاؤ کا وہ

سرگرم رکن رہا، لیکن ایسا بھی نہیں کہ اسے سرے سے سیاست کی کوخبر نہ تھی، بلکہ اسنے اپنے بہت سارے ناولوں میں کو بھی بہت خوبصورتی سے گدگدایا بلکہ چھیڑا ہے، کبھی یہ چھیڑ خانی دبے الفاظ میں کی، کبھی کھلم کھلا بغیر کسی ملامت کے، نجیب سیاسی بے قواعدگیوں پر برہم بھی ہوا، اور اسکی اچھائیوں کا معترف بھی رہا۔

نجیب کا اسلوب انتہائی شاندار خوبصورت و بے مثل تھا، وہ گنجلک اور پیچ در پیچ عبارت کا بالکل قائل نہ تھا، بلکہ وہ ہمیشہ عام فہم، سادہ زبان، حقیقی لگتی باتیں کہتا اور لکھتا، اگر اسکے سارے ناول اور افسانوں کو چھان مارو کہیں اسنے آسمان سے اوپری باتیں نہیں کیں، بلکہ وہ ہمیشہ زمینی حقائق کی باتیں کرتا، سلگتے مسائل پر قلم اٹھاتا، سنجیدہ موضوعات پر توجہ مبذول کرواتا، عوام کو درپیش مسائل کو قلم کے سہارے دور کرنے ی کوشش کرتا، معاشرے میں رونما ہونے والے حادثات کے پس منظر و پیش منظر پر آگاہی دیتا، لوگوں کے افکار ونظریات پر سیر حاصل بحث کرتا، صحیح وغلط کو کو خوبصورتی سے قلم بند کرتا، وہ گھر کے اندر کی کیفیات بھی لکھتا، گھر کے باہر کے حوادث وواقعات بھی، وہ ولادت کی خوشیوں کے چرچے بھی کرتا، اور مرنے والوں پر نوحہ کناں اور ماتم وبین کرنے چیخوں کو بھی قلم کی آواز بناتا، وہ ظلم، زیادتی پر نکیر بھی کرتا، اور اسکی وجوہات کا مثبت جواب بھی دیتا، مظلوموں کو بھی الرٹ اور بچنے کے ذرائع بتاتا، نجیب کی نظر میں ادب وہ ہے جو شئی کے دونوں پہلوؤں پر کلام کرے، فرد کا خوشی پر اترانا بھی دکھائے، اور درد سے بلبلانے پر بھی روشنی ڈالے، جو خوش طبع کو بھی گلے لگائے، اور درماندہ اور غم کے ماروں کی بھی ڈھارس بندھوائے۔ نجیب کی تحریریں قاہرہ کی ان تین بستیوں جمالیہ، غوریہ، عباسیہ، میں رہنے والے متوسط طبقے کے طرز بود و باش، طرز معاشرت، اخلاق وکردار، حادثات وواقعات، نتائج و اثرات، اور درپیش چیلنجز کی عکاسی ہیں، وجہ یہ تھی کہ وہ جو لکھتا تھا، بلکہ وہ پس دیوار کے قصے سرعام آویزاں کرتا تھا۔

نیاز جیراج پوری

آہ! اے مزدور

آہ ! اے مزدور محنت کش جیالے سخت جاں
خون کے آنسو رُلاتی ہے تمہاری داستاں
تم تلاشِ رزق میں رہتے ہو پیہم گامزن
تم بچھاتے اوڑھتے ہو محنت اور تھکن
گردشِ حالات سے دوچار ہوتے رہتے ہو
مشکلوں سے برسرِ پیکار ہوتے رہتے ہو
صبح ہوتے ہی ضرورت سَر اٹھانے لگتی ہے
یاد ذمہ داری کی تم کو آنے لگتی ہے
اُف ! تمہارے بال بچے پھر بھی بھوکے ننگے ہیں
کھیل قسمت نے تمہارے ساتھ کیسے کھیلے ہیں
کل تمہارا حال جیسا تھا ہے ویسا آج بھی
انتظار اچھے دنوں کا تم کو رہتا ہے آج بھی
ملک کی تعمیر میں بے شک تمہارا رول ہے
اہمیت پھر بھی تمہاری کوڑیوں کے مول ہے
دیکھ کر حالت تمہاری ذہن و دِل ہیں بے قرار
کیوں نظر آتا نہیں کوئی تمہارا غم گُسار
دیکھ کر دیکھا نہیں جاتا تمہارا حال اُف!
پیڑ سے جیسے اُدھیڑی جائے کچی چھال اُف!
بے خبر جو تھے تمہارے حال سے ہیں باخبر
اور ہوتی ہے سیاست بھی تمہارے نام پر
تم سے ہمدردی جتانے کی لگی ہے ہوڑ سی
تم کو اپنوں سے ملانے کی لگی ہے ہوڑ سی
ان دنوں خبریں تمہارے بارے میں جو آتی ہیں
ذہن ودِل سے چین، نیندیں آنکھوں سے لے جاتی ہیں
ہو کوئی رُت کوئی موسم کا سے ہے تم کو کام
اے مرے مزدور ساتھی تم کو کرتا ہوں سلام

آبیناز جان علی (موریشس)

ٹوپی والا وائرس

''آپی آپی۔۔۔دروازہ کھولو۔۔۔''

''صفیان رات کے گیارہ بجنے والے ہیں۔ اپنے کمرے میں جا کے سو جاؤ ورنہ امی کو بتا دوں گی۔''

''امی ابو جھگڑا کر رہے ہیں۔ ان کے کمرے سے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔''

''اچھا اندر آ جاؤ۔۔۔وہ جھگڑا نہیں کر رہے ہیں بلکہ موجودہ حالات پر بات کر رہے ہوں گے۔'' صفیان نے اپنی بڑی بہن سدرہ کے پلنگ پر بچھی مخملی گلابی رضائی کو اپنے اوپر تان لیا اور سدرہ کو اپنی بڑی بڑی بھوری آنکھوں سے تکنے لگا۔

''دیکھو کل سے ہم سب گھر پر رہیں گے۔''

''لیکن کل تو میرا ریاضی کا امتحان ہے۔ میں نے بڑی محنت سے تیاری کی ہے۔ اس بار امجد سے زیادہ نمبر لاؤں گا اور کلاس میں اول آؤں گا۔''

''آنے والے دو ہفتوں تک سارے اسکول بند رہیں گے۔ موریشس میں تین افراد کی جانچ سے معلوم پڑا کہ وہ کووڈ ۱۹ سے متاثر ہیں۔ یہ بیماری کرونا وائرس سے پیدا ہوتی ہے۔ کرونا وائرس ایک ایسی وبا ہے جس سے سانس لینے میں تکلیف ہوتی ہے اور کبھی کبھی مزید خطرناک بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔''

''کرونا۔۔۔یہ کیسا نام ہے؟''

''اس وائرس کے سر پر تاج ہے۔ اس لئے کراؤن سے کرونا۔۔۔یہ لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ خوردبین سے نظر آتا ہے کہ یہ ٹوپی پہنتا ہے۔''

''ہاہاہا۔۔۔میں بھی بڑا ہو کر خوردبین سے وبا کو دیکھوں گا۔''

''ہاں ہاں معلوم ہے میرا پیارا بھائی بہت بڑا سائنس داں بنے گا۔ کل ہم اس وبا کا نقش کاغذ پر اتار کر اس پر رنگ چڑھائیں گے۔ اب ہمارے پاس وقت ہی وقت ہے۔ انگلینڈ اور کینیڈا جیسے ممالک میں تو تین مہینوں سے زیادہ چھٹی دے دی گئی ہے۔''

''لیکن پہلے تو کبھی اتنی چھٹی نہیں دی جاتی تھی۔''

''یہ بیماری انسان سے انسان تک پھیلتی ہے۔ اس زنجیر کو توڑنے کے لئے لوگوں سے ایک میٹر کا فاصلہ رکھنا ضروری ہے۔ بھیڑ بھاڑ کی جگہوں سے گریز کرنا ہے۔ اب سرکار نے اس بات پر زور دیا ہے کہ گھر پر رہنا ہے اور بلا وجہ باہر نہیں نکلنا ہے۔''

''آپی ان تین لوگوں کو یہ بیماری کیسے لگی؟''

''ان میں سے ایک شخص انگلینڈ گیا تھا اور باقی دو لوگ بحری جہاز پر کام کرتے تھے۔ جس ملک میں یہ وبا ہے وہاں جانے سے لوگ متاثر ہو سکتے ہیں۔''

''لیکن ابو کا طیارہ بھی تو انگلینڈ گیا تھا؟''

''ہاں لیکن جو لوگ احتیاط کرتے ہیں وہ اس سے بچ سکتے ہیں۔''

''ہاں استانی نسیم فرما رہی تھیں کہ بار بار ہاتھ دھونا چاہئے۔ ہمیں ایک دوسرے سے ہاتھ ملانے سے منع کیا گیا تھا اور ہم سے کہا گیا تھا کہ چہرے پر ہاتھ نہیں رکھنا چاہئے۔''

''بالکل یہ وبا آنکھ، ناک اور منہ کے ذریعے جسم میں داخل ہو کر انسانی سیلوں پر حملہ کرتا ہے اور ان کے اندر چلا جاتا ہے۔''

''ہائے اللہ۔ پھر؟۔۔۔''

''جسم کے سیلوں کے اندر یہ تقسیم ہوتا ہے اور جن سیلوں میں داخل ہوتا ہے انہیں مار دیتا ہے اور پھر آس پاس کے سیلوں کو متاثر کر کے پھیلتا جاتا ہے۔''

''ارے باپ رے۔۔۔ پر یہ وبا ایک آدمی سے دوسرے آدمی کو کیسے لگ جاتی ہے؟'' چھوٹے صفیان نے ذرا غور کرنے کے بعد پوچھا۔

''کووڈ ۱۹ سے متاثر کوئی شخص جب چھینکتا یا کھانستا ہے تو اس کی چھینک کی پھوار میں موجود وائرس آس پاس موجود لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ وائرس آس پاس کی جگہوں پر بھی پھیل جاتا ہے اور ان پر پانچ دنوں تک رہ سکتا ہے۔''

''اس ٹوپی والے وائرس نے تو تھکا دیا۔ میں اپنے کمرے میں سونے جا رہا ہوں۔''

''اچھا۔ شب بخیر۔'' سدرہ نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ آنے والے دنوں کے بارے میں سوچ کر سدرہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

نسرین نے صبح سویرے ریڈیو آن کیا۔ نیشنل ریڈیو کے تینوں ریڈیو اسٹیشنز کو ضم کر دیا گیا ہے اور تینوں پر ایک ہی وگرام ایک ساتھ نشر ہو رہے تھے۔ جہاں تک ہو سکے کم ملازمین سے کام چلایا جا رہا ہے۔ چاروں طرف صرف کووڈ ۱۹ کی ہی خبریں آرہی ہیں۔ قومی قفل بندی کو سات دن ہو گئے ہیں اور اب تک بیالیس افراد متاثر ہو چکے ہیں۔ اب تک دو لوگ لقمہ اجل بھی ہو چکے ہیں۔ سوشل میڈیا پر بھی صرف اس کا ہی چرچہ ہے۔ کئی ڈاکٹر، ماہر نفسیات اور ماہر غذا عوام کو ہدایات دے رہے ہیں اور گھر پر ہی رہنے کی سخت تاکید کر رہے ہیں۔

نسرین نے ریڈیو بند کر دیا اور باورچی خانے میں چائے بنانے کے لئے گیس چلائی۔ گیس کا سلینڈر بھی ہلکا معلوم ہو رہا ہے۔ آج سے سرکار نے تمام دکانوں کو بند کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ وبا پھیلتی جا رہی ہے۔ دکانوں میں سامان خریدتے وقت لوگ اس کے شکار ہو رہے ہیں۔ کھانے کا سامان بھی محدود معلوم پڑ رہا ہے۔ لاک ڈاؤن کا فیصلہ اتنا اچانک ہوا کہ نسرین کو اشیائے خورد ونوش خریدنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بچوں کا ناشتہ تیار کرتے ہوئے نسرین نے اپنے سر درد کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ رات کو دیر سے آنکھ لگی۔ نیند آئی بھی تو برے خواب ستانے لگے۔

شادان کسی دور دراز ملک میں تھا۔ کوری باہیں اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ جہاں کرونا کا حملہ اپنے عروج پر تھا۔۔۔

کیتلی میں ابلتے ہوئے پانی کی آواز نے نسرین کو واپس حقیقت کی دنیا میں پہنچا دیا۔ ایک ہفتے سے شادان الگ کمرے میں رہ رہا ہے۔ جب سے واپس آیا ہے اسے کھانسی ستا رہی ہے۔ دوائی لینے کے باوجود کوئی خاص اثر نہیں ہو رہا تھا۔ کل تو اس کے پیٹ میں بھی درد تھا۔ ڈاکٹر کو فون کرنے پر گھر پر ہی رہنے کی تلقین دی گئی۔ اب تو ہسپتال جانا بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ نسرین نے کھانے کی میز پر سدرہ کے لئے دہی اور پھل رکھے اور صفیان کے لئے کان فلیکس نکالا۔ اس کے بعد سنک میں گندے برتن کو صاف کرنے میں منہمک ہو گئی۔ سامنے کھڑکی سے آنگن کی ہریالی کو دیکھ کر اسے ذرا راحت ملی۔ مکمل خاموشی کی وجہ سے چڑیوں کی چہچہاہٹ زیادہ سننے کو مل رہی ہے۔ باغ میں کیلا، آم، امرود اور ناریل کے پیڑ کے علاوہ مختلف سبزیاں بھی موجود ہیں۔ شادان کی دور اندیشی پر نسرین کو فخر محسوس ہوا۔

''امی مجھے چائے نہیں کاپوچینو چاہئے۔ کان فلیکس کے ساتھ اسٹرابیری کہاں ہے؟''

''ختم ہو گیا صفیان۔ جو ہے وہی کھالو۔''

''نہیں مجھے اسٹرابیری چاہئے۔ کل رات کو پیزا بھی

نہیں ملا تھا۔"

"افففو۔۔۔سمجھا کرو۔ باہر جانا خطرے سے خالی نہیں۔ہم اندر رہیں گے تو ٹوپی والا وائرس باہر رہے گا۔"

"یہ ٹوپی والا وائرس کتنا برا ہے۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ فٹ بال بھی نہیں کھیل سکتا۔"

"اگلے ہفتے سے ٹیوی پر کلاسز نشر کئے جائیں گے۔ اگلی پیر سے تمہیں گھر پر بھی سنجیدگی سے پڑھائی کرنی ہے۔ اس لئے آج تم ویڈیو گیم کھیل سکتے ہو۔"

"سدرہ میرے ساتھ نہیں کھیلتی۔"

"اس سال سدرہ کا بورڈ ایگزام ہے۔اسے محنت کرنی ہے۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتی ہے۔"

"میں بھی خوب پڑھوں گا۔"

"شاباش میرے بیٹے۔"

"امی اس سال تو سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ کیا میں اپنی زندگی کا ایک سال گنوا دوں گی؟" سدرہ نے بے بس نگاہوں سے اپنی والدہ کی طرف دیکھا۔

"کیا کیا جائے۔جان ہے تو جہان ہے۔زندگی نے ساتھ دیا تو تو اپنا خواب ضرور پورا کر پائے گی۔بس یہ برا وقت نکل جائے۔ابھی دھوپ نکلی ہے۔ذرا باہر ہو آؤ۔دن بھر تو گھر پر ہی رہنا ہے۔میں تمہارے ابو کا ناشتہ کمرے میں لے کر جا رہی ہوں۔"

نسرین نے دروازے کے بغل میں رکھی گئی میز پر ناشتے کی طشتری رکھی اور شادان کے دروازے پر دستک دے کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ شادان نے کئی دنوں سے شیو نہیں کیا تھا۔ بال بھی ذرا لمبے ہونے لگ رہے تھے۔

"بخار تو نہیں ہے؟"

"نہیں بس ذرا کھانسی ہے۔"

"تمہارا سینہ گرم تو نہیں ہے؟" نسرین نے دریافت کیا۔

"نہیں بالکل ٹھنڈا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ناشتہ کرلو۔"

شادان طشتری کو کمرے میں لے آیا۔نسرین نے اس کی پسندیدہ کھیر بنائی تھی۔ہوا باز کی نوکری کی وجہ سے وہ مہینے میں مشکل سے دس دن بھی گھر پر رہ پاتا تھا۔ جب بھی گھر آتا تو نسترین اور بچے اپنی اپنی زندگیوں میں اتنے مصروف نظر آتے کہ شادان خود کو اپنے گھر میں اجنبی سا محسوس کرتا۔آج بھی اجنبی سا اکیلے کمرے میں پڑا ہے۔شادان نے غور کیا کہ اس بار نسرین کی رفتار سست نظر آ رہی ہے۔ صبح کام کے لئے جلدی جلدی سب کو تیار کرنے کی جگہ وہ آرام اور خندہ پیشانی سے گھر چلا رہی ہے۔ اس کی آنکھوں کے گرد کالے حلقے کم ہو گئے تھے۔ اس کا رنگ زیادہ نکھر گیا تھا۔ وہ زیادہ آرام سے باتیں بھی کرنے لگی ہے۔

شادان نے کمرے کا ٹیوی آن کیا ۔ہیڈ لائنس پڑھتے ہی، اس نے کھیر سے بھری چمچ طشتری میں واپس رکھ دی۔ ائیر موریشس کو اس لاک ڈاؤن سے بھاری نقصان ہوا ہے اور اب مستقبل میں نہ معلوم کیا صورتِ حال رہے گی۔ شادان زور سے کھانسنے لگا اور پیٹ کا درد دوبارہ شروع ہو گیا۔ ڈر بھی طرح طرح کے رنگ دکھاتا ہے۔ اس مہینے معلوم نہیں پوری تنخواہ ملے گی بھی یا نہیں۔

ٹیوی بند کر کے، شادان باہر بالکنی پر چلا گیا۔ فینکس شہر میں اس کا مکان سب سے عالیشان اور سب سے بڑا تھا۔ہوا باز کی نوکری نے اسے کیا کچھ نہیں دیا۔دنیا بھر کی سیر کروائی۔مختلف رنگ و نسل کے لوگوں سے رابطہ کرایا۔ طیارے کو ہوا میں اڑاتے ہوئے وہ مسحور ہوتا۔ مسافروں کو ان کی منزل تک پہنچاتے ہوئے اس کا سر فخر سے اور اونچا ہو جاتا۔ آسمان پر چھائے بادل کو دیکھ کر شادان کے دل میں کسک پیدا

ہوئی۔ کیا اب وہ کبھی اس پار جا پائے گا؟ اس نے غصّے سے مٹھیاں بھینچ لیں اور دل ہی دل میں اس وبا کو کوسنے لگا۔

''آپی وہ دیکھو باغ میں نیا گلاب کھلا ہے۔'' اس کے آٹھ سال کے بیٹے کی آواز نے اسے زمین کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ سدرہ اور صفیان کو دیکھتے ہی وہ ذرا مسکرانے لگا۔

''بچے کتنی جلدی بڑے ہو جاتے ہیں!'' ابھی کچھ سال پہلے نسرین اور وہ بچوں کو لے کر پیرس کے ڈسنی لینڈ گئے تھے۔ صفیان میکے ماؤس کے ساتھ فوٹو کھینچتے وقت کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔

شادان کا فون بجنے لگا۔'ہاؤ آر یو ڈارلنگ؟'

'تمہیں یاد کر رہا تھا۔'

'یہ دنیا پر کیسی آفت آگئی ہے کہ دو پیار کرنے والے ایک دوسرے سے جدا ہیں۔تم دنیا کے اس پار ہو اور میں اس پار۔کیسا ظلم ہے؟'

شادان کی خالی طشتری میز سے اٹھانے کے بعد، نسرین نے اپنے ہاتھوں کو صابن سے خوب دھویا۔ انگلیوں کو آپس میں ملاتے ہوئے اس کی نظر شادی کی انگوٹھی پر گئی۔اس کے آنسو خود بخود نکلنے لگے۔آج لاک ڈاؤن کا بارھواں دن ہے۔اب تک تین لوگوں کی جانیں جا چکی ہیں۔ان لوگوں کی میت پر ان کے گھر والے شامل نہیں ہو سکتے۔اب تک کسی کے ٹھیک ہونے کی خبر نہیں ملی۔ستم بالائے ستم ہسپتال کے اسٹاف بھی وبا سے متاثر ہو رہے ہیں۔ وبا کی زد میں اب ایک سو تیرا لیس مریض آگئے ہیں۔ نسریں نے خود کو غور سے آئینے میں دیکھا۔

'تمہیں خود کو سنبھالنا ہوگا۔اپنا خیال رکھو۔ہمت بلند رکھو۔'

نسریں نے آنکھیں پونچھیں۔مراقبہ کرنے کے لئے اپنے کمرے میں نیلی چٹائی بچھائی۔ نیچے بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے اور گہری سانسیں لیتے ہوئے شادان کا چہرہ آویزاں ہوا۔شادان گھر پر ہوتے ہوئے بھی اس سے دور تھا۔ وہ اپنے شوہر کی آغوش میں سکون نہیں پا سکتی۔نسریں جلدی جلدی سانسیں لینے لگیں۔ یہ سانسیں کتنی قیمتی ہیں۔یہ خدا کا دیا ہوا نایاب تحفہ ہے۔اس کو ایسے گنوایا نہیں جا سکتا۔ وقت ایک نعمت ہے جو بار بار نہیں ملتا۔نسرین نے آنکھیں کھولیں اور اٹھ کر اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور اپنا ورک پلان بنایا۔اس کے بعد اپنے اسکول میں میل کر دیا۔ساتھ میں یہ بھی لکھا کہ وہ کون سے دن اور کس وقت زوم پر اپنے طلباء و طالبات کے ساتھ آن لائن کلاس لے گی۔ اس کے بعد نسرین نے اپنی کاپی کھولی اور اپنے کورس کے لئے پڑھائی کرنے لگی۔ اس کے بعد اس نے طے کیا کہ صفیان کے لئے پیزا بنائے گی۔ پھر الماری کی صفائی کرے گی۔ ایک سکون سا اس پر طاری ہو گیا۔

شادان نے اپنے کمرے سے باہر قدم رکھا۔ اس نے آج شیو کر کے اچھے کپڑے پہنے تھے۔آج اس کے چودہ دن پورے ہو گئے تھے اور وہ بالکل ٹھیک تھا۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا صفیان دوڑتا ہوا ابو کے گلے سے لپٹ گیا۔اس کے بعد سدرہ بھی شامل ہو گئی۔ نسرین کو دیکھ کر شادان نے کہا:

''آج دکانیں پھر سے کھلنے والی ہیں۔میں گیس اور راشن لے آتا ہوں۔''

''ابو باہر جانا خطرے سے خالی نہیں۔ٹوپی والا وائرس اندر آجائے گا۔''

''نہیں بیٹا میں پورا خیال رکھوں گا۔ ماسک اور دستانے پہنوں گا اور سارا ساماں کچھ دنوں کے لئے باہر ہی رکھیں گے۔ پھر میں واپس آکر نہاؤں گا۔''

''میرے لئے اسٹرابیری لانا۔''

''ہاں ہاں لے کر آؤں گا۔''

''دکانوں میں صرف آدھے گھنٹے کی خریداری کی اجازت دی جا رہی ہے۔ پھر قطار بھی بہت لمبی ہوگی۔ہر انسان

کے درمیان ایک میٹر فاصلے کی پابندی رکھی جارہی ہے۔'' نسرین نے یاددلایا۔

''ہاں مجھے لگتا ہے کافی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ لیکن جانا ضروری ہے۔''

''فی امان اللہ!'' آج کئی دنوں بعد شادان اور نسرین نے آنکھیں ملائیں۔

''نسرین تم نے خبر سنی؟'' شادان دوڑتا ہوا آیا۔

''کیا ہوا؟''

''کنسٹرکشن کمپنی کے چیرمین وبا کے شکار ہو کر آج وفات پاگئے۔''

''کہیں وہ پیٹرک صاحب تو نہیں جن سے ہم نئے سال کی پارٹی میں ملے تھے؟''

''ہاں ہاں وہیں۔''

''افسوس کی بات ہے۔اتنا بڑا کاروبار چلانے والا انسان۔۔۔اس وبا نے تو وزیر اعظم اور شہزادے کو بھی نہیں بخشا۔''

''یہی نہیں پیٹرک کے ساتھ ساتھ آج ایک فقیر کی بھی اس وبا نے جان لی ہے۔'' نسرین کے چہرے کی اداسی دیکھتے ہوئے شادان نے اسے گلے لگالیا۔نسرین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔شادان اسے سہلانے لگا۔

''موت کے سامنے کسی کی نہیں چلتی نسرین۔ ہم جب تک زندہ ہیں ہمیں خوشی خوشی یہ زندگی جینی چاہئے۔۔۔۔اب تک تین سوانیس لوگ شکار ہوگئے ہیں۔''

''ایسا چلتا رہا تو ہم کئی مہینوں تک گھر میں بند پڑے رہیں گے۔ رمضان بھی اسی طرح نکل جائے گا۔ مجھے میری زندگی واپس چاہئے۔'' نسرین چلانے لگی۔

''ایسی زندگی جس میں میں غیر حاضر تھا؟'' نسرین پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے شوہر کو تکنے لگی۔

احمد علی برقی اعظمی

کرونا وائرس

چین کو اپنا بنایا ایسا کورونا نے شکار
ہوگیا سارے جہاں میں جس سے برپا انتشار
اس کے شر سے مانگتا ہے ہر کس و ناکس پناہ
ابن آدم کے لیے ہے روح فرسا اس کا وار
ہے یہ مہلک وائرس سب کے لیے سوہان روح
گلشن ہستی کی ہے جس سے خزاں دیدہ بہار
گر رہے ہیں اوندھے منہ دنیا میں شیئر مارکیٹ
ہوگئے برباد کتنوں کے نہ جانے کاروبار
لرزہ براندام ہیں سارے جہاں میں اس سے لوگ
ہیں مضر اثرات سے اس کے مسافر بے قرار
ہر ہوائی اڈے پر ہے افرا تفری آج کل
جانے کب ماحول ہوگا پھر دوبارہ سازگار
درس عبرت ہے ہمارے واسطے فطرت سے جنگ
دامن نوع بشر ہے آج جس سے تار تار
خود بناکر وائرس سے جوہری ہتھیار ہم
اپنی بد اعمالیوں کی جھیلتے ہیں آج مار
آج تک اس کا نہ تھا برقیؔ کوئی وہم و گماں
جان لے لیں گے کسی کی نزلہ کھانسی اور بخار

''کیوں نہ اس وقت کا شکر ادا کرتے ہیں جس نے ہمیں ایک ساتھ رہنے کا موقع دیا۔'' نسرین کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''اگلے ہفتے صفیان کی سالگرہ ہے۔'' شادان نے نسرین کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔ ''کسی کو بلا نہیں سکتے تو کیا ہوا۔ ہم چاروں مل کر منائیں گے۔ تم صفیان کے لئے بلیک فاریسٹ کیک بنانا۔ آنگن کو سجانے کی ذمے داری میری۔'' نسرین مسکرا اٹھی اور شادان اس کے چہرے کو چومنے لگا۔

ثنا غزل (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی)

پروفیسر محمد انصار اللہ: ایک تعارف

پروفیسر محمد انصار اللہ کی پیدائش اعظم گڑھ میں 4رجنوری1936ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، والد کا نام محمد مطیع اللہ تھا، (اپنے عہد کے تعلیم یافتہ انسان تھے، ان کے اپنے وقت کے اہم ادیبوں، شاعروں اور معزز شخصیات سے قریبی مراسم تھے۔ 1959ء میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور 19رجون1972ء کو کانپور میں انتقال کیا۔) انصار اللہ کا اپنا بیان ہے کہ ''میں نے بہت جلد بولنا شروع کر دیا تھا، دو برس کی عمر میں بڑے بھائی کا سبق سن کر خود سنانے لگا تھا۔۔۔ جس وقت میں قاعدہ پڑھتا تھا، سورہ عم بڑے بھائی سے سن کر یاد کر لی تھی، قرآن پاک ختم کر کے فارسی پڑھی کریما، ما مقیمان، قادر نامہ، وغیرہ کو زبانی یاد کر لیا تھا'' ماسٹر مظہر نے ریاضی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم دی اور ان کے مشورے سے محمد انصار اللہ اور ان کے بھائی محمد سمیع اللہ کو اسکول میں داخل کیا گیا۔ ملک کے بٹوارے کے بعد سمیع اللہ پاکستان چلے گئے اور بہتر تعلیم کی بدولت انگریزی کے پروفیسر ہوئے۔ محمد انصار اللہ ساتویں جماعت سے پروفیسر نذیر احمد کی سرپرستی میں رہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جب سر ضیاء الدین نے میڈیکل کالج کا منصوبہ بنایا تو اسی خیال کے پیش نظر ان کا داخلہ سائنس میں کرایا گیا۔ 1954ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد محکمۂ صنعت و حرفت میں اکاؤنٹس کی ملازمت سے آراستہ ہوئے۔

محمد انصار اللہ کو اردو سے ایک خاص لگاؤ اور وابستگی تھی چنانچہ ملازمت سے منسلک ہونے کے باوجود اردو میں تحریر و تالیف اور مضامین لکھنے کا سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ اسی شوق کے پیش نظر 1963ء میں گورکھپور یونیوسٹی سے ایم۔ اے (اردو) اور پھر 1966ء میں پی ایچ۔ ڈی کیا۔ لہٰذا (پی ایچ۔ ڈی کے لیے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اس کے مکمل ہونے کے بعد صدیق نیشنل کالج پیلی بھیت میں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے۔) علی گڑھ شعبہ اردو کی جانب سے جب ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' کی پہلی جلد شائع ہو کر ضبط ہوگئی تو اس کی تصحیح کے لیے پروفیسر آلِ احمد سرور نے ان کا انتخاب کیا۔ ستائس دن تک ریسرچ فیلو کی حیثیت سے کام کیا اور اٹھائیسویں دن یعنی 28رجولائی1967ء کو شعبہ اردو میں لکچرر مقرر ہوگئے۔ 1983ء میں ترقی کر کے ریڈر ہوئے، بڑے خود دار قسم کے آدمی تھے کبھی کسی کا احسان لینا یا سفارش کرنا گوارا نہ کیا لہٰذا 1993ء میں پروفیسر کے عہدے پر فائض ہوئے اور 1996ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ ملازمت کے بعد بھی تحقیقی و تصنیفی کام میں دلجمعی سے لگے رہے۔

پروفیسر محمد انصار اللہ کا شمار اردو کے نامور محققین میں کیا جانا چاہیے۔ ان کے تقریباً پانچ سو تحقیقی وتعارفی مضامین ملک و بیرون ملک کے رسالوں میں شائع ہوئے۔ انھیں لکھنے کا خوب شوق تھا اس کی ابتدا انھوں نے 1950ء سے چھوٹے چھوٹے قصوں سے کی۔ پہلا مضمون نیاز فتح پوری کے رسالے ''نگار'' میں شائع ہوا آہستہ آہستہ ان کا رجحان تحقیقی مضامین کی طرف ہوا اور 1955ء سے مستقل تحقیقی مضامین لکھنے لگے اور یہ سلسلہ عمر کے آخری حصے تک مسلسل جاری رہا۔ ان کو اردو سے

اس قدر محبت تھی کہ کتابیں محض شوق کی خاطر اپنی جیب سے شائع کرادیتے تھے۔ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

''اللہ تعالیٰ کا میرے حال پر بڑا احسان یہ ہے کہ نادر تحقیقی نکتے خود بخود ذہن میں آجاتے ہیں۔۔۔ میں نے بیشتر کتابیں محض اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے اپنے خرچ سے چھپوائی ہیں''

(نیادور،لکھنؤ،ستمبر1992ء،ص7)

پروفیسر محمد انصاراللہ نے سو سے زائد کتابیں تصنیف وترتیب کیں، بابائے اردو مولوی عبدالحق کی روش پر چل کر بہت سی قدیم کتابوں کو جدید ترتیب کے ساتھ مرتب کر کے شائع کرائیں۔ان کی پزیرائی ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی ہوئی، مشہور محقق اور تاریخ ادب اردو کے خالق ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی ان کی تعریف کی ہے۔ یہاں چند اہم کتابوں کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے تاکہ اردو تحقیق میں پروفیسر محمد انصاراللہ کی خدمات کا کچھ حد تک احاطہ کیا جاسکے۔

''اردو صرف''(1975ء)''اردو نحو''(1975ء)

دونوں کتابیں اردو قواعد کے متعلق ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ابتدائی درجات کے طلبہ کے لیے قواعد کافی مشکل فن رہا ہے۔ چنانچہ اسی ضرورت کے پیش نظر ان کتابوں کو تیار کیا گیا ہے۔ ان کتابوں میں محمد انصاراللہ نے اردو قواعد آسان لفظوں میں بیان کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں اردو قواعد کے لیے حد درجہ مفید اور کارآمد ہیں۔طبع ثانی کے پیش لفظ میں مصنف لکھتے ہیں:

''یہ رسالہ''اردو صرف''میں نے اب سے بارہ برس پہلے1975ء میں اسدیار خان صاحب مالک ایجو کیشنل بک ہاؤس کی فرمائش سے ابتدائی درجات کے طالب علموں کے لیے مرتب کیا تھا۔''

(اردو صرف ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ2012ء(ص14)

''تاریخ ادب اردو''(2012-16ء)''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کے تحت تاریخ ادب اردو کی تصنیف کا جو پروجکٹ شروع کیا گیا تھا اس کی ابتدائی پانچ جلدیں(ابتدا سے1700ءتک)سیدہ جعفر اور گیان چند جین نے مشترکہ طور پر تصنیف کیں اسی پروجکٹ کی جلد نہم سے جلد سترہ تک(1811ء سے1911ءتک)محمد انصاراللہ نے تنہا تخلیق کیا۔نو جلدوں پر مشتمل ان کا یہ تخلیقی کام انیسویں صدی کی زبان اور نثر و نظم کا احاطہ کرتا ہے جو کہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔بقول مصنف''اردو ادب کی تاریخ کو(1221ھ/1806ءتا1253ھ1837ء)علاقائی تقسیم کے ساتھ اس طور پر مرتب کرنے کی یہ پہلی کوشش ہے۔''

(تاریخ ادب اردو1858تا1914ء،ص:vi)

''جامع التذکرہ'' تین جلدوں پر مشتمل یہ کتاب بھی محمد انصاراللہ کا اہم کارنامہ ہے جو کہ'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' سے شائع ہوئی ہے۔

''اردو میں تدوین''(2014ء) یہ محمد انصاراللہ کے ان اہم مضامین کا مجموعہ ہے جو رسالوں میں شائع ہو چکے تھے ان مضامین کی تعداد ستر ہے۔حالاں کہ ان کے علاوہ بھی ان کے سیکڑوں اہم مضامین مختلف رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں یکجہ صورت میں منظر عام پر لایا جائے تاکہ عام قاری اس سے استفادہ کرسکیں۔

''غالب ببلیو گرافی''(1998ء)محققین کے لیے اہم تحفہ ہے۔اس کتاب میں مرزا اسد اللہ خان غالب سے متعلق کتابوں کے نام،متفرق تصانیف، رسالوں میں شائع مضامین، ایم۔اے ،ایم۔فل، پی ایچ۔ ڈی کے مقالے، رسالوں کے غالب نمبروں کے علاوہ دوسری زبانوں مثلاً

(اطالوی، انگریزی، بلوچی، بنگلہ، جرمن، روسی، عربی، فارسی، فرانسیسی، مرہٹی، ہندی اور یوکرین) میں غالب سے وابستہ اس وقت تک کی تخلیقات کا اس میں احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ اول ''غالب سے متعلق کتابیں'' حصہ دوم ''کتابوں میں غالب'' حصہ سوم ''رسالوں کے مضامین'' آخر میں ضمیمہ اور اشاریہ شامل ہے۔

''مونوگراف'' داتا دیال مہرشی شیو برت لال ورمن (1991ء) یہ کتاب ساہتیہ اکادمی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ مصنف نے اس میں داتا دیال کی زندگی اور شخصیت پر تفصیلی سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے جسے ڈاکٹر عزیز پریہار نے کیا ہے۔

''معتمدالدولہ آغا میر اسلاف و اخلاف'' (1988ء) یہ کتاب بھی غالب سے متعلق ہے جو غالب انسٹی ٹیوٹ سے 1988ء میں شائع ہوئی ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں اس کی اہمیت اور وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے ''محمد شفیع قریشی'' (سکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ) لکھتے ہیں:

> ''اودھ کی حکومت میں معتمدالدولہ کی اس وقت بڑی حیثیت تھی اس کے باوصف اب تک ان کے حالات پر کوئی ڈھنگ کا کام نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر انصاراللہ کی یہ کتاب اس کمی کو پورا کرتی ہے توقع کی جاتی ہے کہ اس طرح اودھ کی اس معروف شخصیت کے حالات سے بہت سے لوگ تفصیل کے ساتھ واقف ہو سکیں گے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے پروگرام میں بات بھی شامل ہے کہ ایسی کتابیں شائع کی جائیں جن سے غالب اور عہد غالب کو سمجھنے میں مدد ملے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔''
> (ص6) ''معتمدالدولہ آغا میر اسلاف و اخلاف''

''پدماوت کی مختصر فرہنگ'' (1972ء) مصنف (ملک محمد جائسی) پدماوت اودھی زبان میں 1540ء میں لکھی گئی۔ اس میں چتوڑ کے راجہ رتن سین اور رانی پدماوتی کی محبت کا قصہ اور علاوء الدین خلجی کے رانی پدماوتی کے عشق میں مبتلا ہونے اور چتوڑ کے قلعے پر چڑھائی کی داستان ہے۔ محمد انصار اللہ نے اس کی فرہنگ تیار کی ہے۔ یہ کتاب لیتھوکلر پرنٹرس علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ فرہنگ کو اردو کے حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ محمد انصاراللہ اس کتاب کی تصنیف سے متعلق لکھتے ہیں کہ ''یہ فرہنگ اپنے ذاتی مطالعہ کے لیے تیار کی تھی۔ اپنے دوست مولانا نہاں مئوی کی ہمت افزائی پر شائع کروایا'' اس کتاب کی ایک اہم خاصیت یہ ہے کہ لفظ کا لغوی معنی نہ لکھ کر اس کا مطلوب معنی لکھا گیا ہے۔ اس کے مقدمہ میں ملک محمد جائسی اور ان کی تصانیف کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔

''شعرائے اردو کے اولین تذکرے'' (1978ء) اس کتاب میں ان تذکروں کا ذکر کیا گیا ہے جو اولین تذکروں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ کتاب بھی لیتھوکلر پرنٹرس علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب پر اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام سے بھی نوازا۔ صاحب مصنف نے کتاب میں صنف تذکرہ کی اہمیت اور تاریخ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ لہٰذا اس کے مقصد اور معنی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تذکرے تاریخ، سوانح یا تنقید کی کتابیں نہیں ہیں اس لیے ان سے ان توقعات کا وابستہ کرنا جو تاریخ، سوانح یا تنقید کے ساتھ مختص ہیں بیجا ہے۔ ان کا مقصد پڑھنے والے سے مجملاً بعض شاعروں کو متعارف کرا دینا ہوتا ہے اور بس لفظ ''تذکرہ'' خود اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ اس کتاب میں کسی کا ذکر کیا جا رہا ہے۔'' (ص8)

کتاب میں درجہ ذیل تذکروں کا ذکر ہے۔ ''تحفتہ الشعرا'' (مرزا افضل بیگ)، ''گلشن گفتار'' (خواجہ خان حمید)، ''گلشن راز'' (فتح علی خان)، ''نکات الشعرا'' (میر تقی میر)، ''مخزن نکات'' (شیخ محمد قایم چاند پوری) اور ''ریاض حسینی'' (عنایت اللہ فتوت)۔ مصنف نے ان تمام تذکروں کے طریق کار پر بھی تفصیلی بحث کی ہے۔

محمد انصار اللہ ایک اہم مدون بھی تھے انھوں نے اردو اور فارسی کے درجنوں قدیم مخطوطات اور غیر مطبوعہ نسخوں کو تدوین کے مراحل سے گزار کر شائع کیا ہے۔ ''تلخیص معلّٰی'' (کلب حسین خان نادر) دو جلدوں میں۔ ''زبان ریختہ'' (عبدالغفور خان نساخ) ''برہن کی کہانی'' (مقصود لکھنوی) برہن کی کہانی ایک بارہ ماسہ ہے جس میں بارہ ماسہ کی اہمیت و افادیت اور ارتقا سے متعلق تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ صاحب مرتب لکھتے ہیں:

''بارہ ماسہ میں فراق کی کیفیات کا بیان ہوتا ہے۔ تنہائی کا احساس اور محبوب سے ملاقات کی تمنا بس یہی بارہ ماسہ کا مقصد اور موضوع ہوتا ہے۔ (ص22)

محمد انصار اللہ ایک عمدہ ترجمہ نگار بھی تھے۔ انھوں نے ہندی اور سنسکرت کی کئی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ''کبیر پداولی'' (مصنف ڈاکٹر رام کمار ورما) کا ترجمہ ''شعر کبیر'' کے نام سے کیا ہے۔ کبیر پداولی گرو گرنتھ صاحب سے ماخوذ کبیر کے کلام کا مستند مجموعہ ہے۔

محمد انصار اللہ کو ابتدائی زمانے میں شاعری کا شوق بھی ہوا وہ نظر تخلص کرتے تھے حالاں کہ وہ شاعری میں کچھ خاص پہچان بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تک بندی سے شعر گوئی کی ابتدا کی اور چند نظموں اور غزلوں پر اس کا اختتام ہو گیا۔ ان کے مطابق 1953ء سے شعر کہنے لگے تھے، شاعری کے استاد شفیق جونپوری (م/1963ء) تھے۔ شفیق جونپوری کے انتقال کے بعد شعر گوئی ہمیشہ کے لیے ترک کر دی۔ اس طرح ان کی شاعری کا زمانہ محض دس سالوں پر محیط ہے۔

پروفیسر محمد انصار اللہ کو اردو ادب میں ان کی علمی ادبی اور تخلیقی خدمات کے صلے میں متعدد ایوارڈوں سے نوازا گیا۔ فہرست ملاحظہ کریں:

انعامات مغربی بنگال اردو اکیڈمی کلکتہ (1988ء)

برائے معتمد الدولہ، اسلاف اور اخلاف

اتر پردیش اردو اکیڈمی برائے پدماوت کی مختصر فرہنگ، قاعدہ ہندی ریختہ عرف رسالہ گلکرسٹ اور صہبائی ایک مختصر تعارف

امتیاز میر کل ہند میر اکیڈمی، لکھنو، (1985ء)

نوائے میر کل ہند میر اکیڈمی، لکھنو، (1993ء)

فخر الدین علی احمد، غالب انعام از غالب انسی ٹیوٹ، نئی دہلی (2009ء) برائے اردو تحقیق و تنقید

محمد انصار اللہ نے ایک طویل مدت اردو ادب کی خدمت میں صرف کی، ان کی بدولت اردو کے سرمایہ میں کافی اضافہ ہوا۔ ان کی گراں قدر ادبی خدمات کے باوجود اب تک ان کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اردو کے اس جاں باز قلم کار کی تخلیقات اور کارناموں کو منظر عام پر لائیں یہی ان کے تئیں سچا خراج عقیدت ہوگا۔

طویل علالت کے بعد اکیاسی برس کی عمر میں پروفیسر محمد انصار اللہ کا انتقال 22/اکتوبر 2017ء کو علی گڑھ میں ہوا۔ انتقال کے وقت چھ بیٹیاں اور دو بیٹے چھوڑے۔ ان کی تدفین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں عمل میں آئی۔

(بحوالہ: اردو بک ریویو، اکتوبر تا دسمبر 2017ء)

منظر عباس زیدی (ریسرچ اسکالر جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی)

ایرانی معاشرے میں مرد سالاری کا وجود، جلال آل احمد کی داستانوں کے حوالہ سے

چکیدہ: "وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ"

خواتین بقائے انسانیت کا ذریعہ ہیں، خواتین گھریلو ذمہ داریوں سے لیکر زندگی کے ہر شعبہ میں مرد کے شانہ بشانہ کھڑی رہی ہیں۔

ایران میں انیسویں صدی تک خواتین کے حقوق پر نظر ڈالیں تو جز تاریکی کچھ نظر نہیں آتا۔ ایران میں قاجاری دور حکومت تک خواتین کے حقوق کی کوئی خاص تحریک نہیں ملتی۔

دورۂ مشروطیت میں حقوق خواتین کی تحریک کی موثر آواز ابھرنا شروع ہوئی۔ ایرانی ادب میں جن مفکرین نے خواتین کے حقوق کی حمایت کی اور انکی پسماندہ صورتحال کو اجاگر کیا، ان میں سے جلال آل احمد ایک امتیازی شخصیت کے حامل ہیں۔

اس مقالہ میں جلال آل احمد کی منتخب داستانوں کا جایزہ لیتے ہوئے، ایرانی معاشرے میں مرد سالاری کے وجود پر بحث کی گئی ہے، جس سے اس دور کے معاشرے میں ایرانی خواتین کی صورتحال نمایاں ہوتی ہے۔

کلیدی الفاظ: حقوق خواتین، مرد سالاری، مساوات جنسی، جلال آل احمد۔

جلال آل احمد کی داستانون میں ایرانی معاشرے میں موجود، مرد سالاری کا جائزہ:

انیسویں صدی کے وسط میں ایرانی معاشرے نے جدیدیت کی طرف قدم بڑھائے، جس میں خواتین کے حقوق بھی شامل تھے۔ ایران میں آئینی تحریک (Constitutional Movement) کے واقعے نے ایرانی خواتین کو اپنے حقوق کے لئے لڑنے کی ترغیب دلائی۔ اس کے علاوہ، دوسری جنگ عظیم کے وقوع اور اس کے نتیجے میں رضا خان کے خاتمے نے، ایران میں خواتین کی تحریک کا ایک اور صفحہ کھول دیا تھا۔

ایران میں قاجاری اور پہلوی سلطنت کے دور تک خواتین کاملا مردوں کے تابع و ماتحت زندگی گذارتی تھیں، ان کے پاس کوئی خاص اختیارات نہیں تھے، وہ مردوں کے تابع اور فرمانبردار ہوکر ایک محرومیت اور لاچاری کی زندگی بسر کرتی تھیں۔

زیادہ اہم بات یہ ہے کہ، اس موقع پر ایران میں برابری کے لئے خواتین کی جدوجہد کو منظوری دی گئی اور اس تحریک کی ایک بڑی تعداد میں ایرانی دانشوروں جیسے محمد علی حجازی، صادق ہدایت، علی دشتی اور بزرگ علوی نے بھی حمایت کی۔ فارسی ادب میں یہ دانشور خواتین کے حقوق کو پہچاننے والے اولین افراد میں شامل تھے اور انہوں نے ایران میں خواتین کی صورتحال کو مستحکم کرنے کی بھرپور کوششیں کیں۔

جلال آل احمد (1969-1923)، ان مشہور مصنفین و مفکرین میں سے ایک تھے جنہوں نے اس تحریک کی حمایت کی۔ وہ اپنے کاموں میں خواتین کی صورتحال کو صحیح طریقے سے دریافت کرنے کے کافی اہل اور خواہش مند تھے. انہوں نے ہمیشہ ایران جیسے مرد سالار معاشرے میں خواتین کے حقوق کی حمایت کی۔ آل احمد کے مطابق، ایرانی معاشرے میں خواتین کی اس پسماندہ اور ذلت آمیز صورتحال کی ذمہ دار، مرد سالاری کا وجود ہے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی داستانیں معاشرے کی محروم خواتین کے نقطہ نظر سے لکھیں ہیں۔

جلال آل احمد کی کہانیوں میں خواتین ایک مرکزی مقام رکھتی ہیں۔آل احمد نے اکثر اپنی کہانیوں میں خواتین اور ان کے مسائل پر توجہ دی ہے۔ان کی کہانیوں کے مجموعے زن زیادی، سہ تار اور پنج داستان، خواتین کے مسائل سے بھرپور ہیں۔

جلال آل احمد کی کہانیوں میں خواتین خود کو حقیر تصور کرتی ہیں اور مرد کے زیر اقتدار زندگی بسر کرتی ہیں۔ان کے پاس نہ کوئی حق ہ، نہ آزادی۔آل احمد نیمردوں پر خواتین کے منحصر ہونے کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔مندرجہ ذیل، آل احمد کی داستانوں سے کچھ اقتباسات بطور مثال ذکر کیے جاتے ہیں۔

داستان بچه مردم:(s ChildPeople)

یہ کہانی ایک ایسی خاتون کے بارے میں ہے جس کو اس کا سابق شوہر طلاق دیدیتا ہے اور چونکہ وہ غریب ومفلس ہوتی ہے اور زندگی گذارنے کے لیے مرد پر منحصر ہوتی ہے اس لیے دوسری شادی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ دوسرے شوہر کے کہنے پر اپنے عزیز ترین رشتہ اور جگر گوشہ، اپنے بیٹے کو بھی ترک کر دیتی ہے:

""تو میں کیا کرسکتی تھی؟ میرا شوہر مجھے بچے کے ساتھ رکھنے کے لئے تیار نہیں تھا۔وہ بچہ صرف میرا تو نہیں تھا، میرے سابقہ شوہر کا تھا جس نے مجھے طلاق دے دی تھی اور بچے کو لینے سے انکار کر دیا تھا۔اگر میری جگہ کوئی اور ہوتی تو کیا کرتی؟ ٹھیک ہے مجھے بھی تو زندگی گذارنا تھی۔اگر میرا یہ شوہر بھی مجھے طلاق دے دیتا، تو میں کیا کرتی؟ اس لیئے میں مجبور تھی کہ کسی طرح بچہ کو ترک کردوں۔""

آفتاب لب بام:

ایک مذہبی اور روایتی فیملی کی کہانی ہے۔یہ کہانی ماہ رمضان میں واقع ہوتی ہے۔اس داستان میں ایک روایتی باپ کو، سخگیر اور مرد سالار و پدر سالار کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے، جو خود کو فیملی کا سردار و سربراہ سمجھتا ہے۔گھر کا کوئی فرد بھی اسکے سامنے بولنے کی ہمت نہیں کرسکتا ہے، یہ شخص دو لڑکیوں کا باپ ہے جو دس اور بارہ سال کی ہیں اور دونوں روزہ رکھنے کی وجہ سے خستہ حال بیٹھی ہوئی ہیں، کہانی دن کے سہ پہر میں واقع ہوتی ہے، باپ نماز کے بعد بچیوں کو چائے بنانے کے لیے بولتا ہے، بچیاں خستگی کے سبب کام کرنے کی ہمت نہیں کر پاتیں تو ان کی نافرمانی پر انہیں مارتا ہے:

"بچیوں کے والد نے مصلی سے ہی آواز دی: صغرا! اٹھو اور سماور (نوع کیتلی) کو اُس طرف لے جاؤ، بچے روزہ کی وجہ سے خستہ اور بے حال تھے ..... والد کے کہنے پر کسی نے توجہ نہیں دی . باپ کا حوصلہ ختم ہو رہا تھا ... اذان کہی اور اقامت دیتے وقت لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوکر کہا: تم سے ہی کہہ رہا ہوں! بتول تم اٹھو سماور کو اُدھر رکھو . چای تیار کرو ...... صغرا! اٹھو، برف لیکر آؤ! چھوٹی والی بچی تھوڑا ہلی اور کہا: ایش خدایا! اور چپ ہوگئی، اب انکے باپ تحمل نہ کرسکے، تیزی کے ساتھ آنگن کی طرف دوڑے، بچیاں جان بچا کر بھاگنے لگیں، انکی ماں نے جو اپنے کام میں مشغول تھی، سر کو اٹھایا اور پھر کام میں مشغول ہو گئی، لڑکیاں صحن خانہ کی طرف بھاگیں تو باپ بھی ننگے پاؤں انکے پیچھے بھاگنے لگا، پدر سوختہ ہا! (فحش ایرانی) قبر پدر مادرتان سگ..(فحش) ... بچیاں ہر طرف بھاگ رہی تھیں . باپ صغرا کی طرف بھاگا اور اسکو مارنے لگا".

زن زیادی:

آل احمد اس داستان میں ایک 34 سال کی خاتون کی بے بسی ولاچاری کو بیان کرتا ہے کہ جسکے سر سے بال ختم ہو گئیہیں اور وہ مصنوعی بال لگاتی ہے، اس کا شوہر باوجود اس کے کہ وہ شادی سے پہلے ہی یہ جانتا تھا، اسکو شادی کے چالیس روز بعد ہی طلاق دے دیتا ہے، جبکہ اس شخص میں خود بھی عیوب ہوتے ہیں لیکن چونکہ وہ مرد ہے تو اسکے عیوب کو نظر انداز کر دیا

جاتا ہے، وہ خاتون طلاق کے بعد خود کو شوہر اور باپ کے گھر میں فالتو ہونے کا احساس کرتی ہے:

''میں کیسے یہ تحمل کروں کہ باپ کے گھر میں 34 سال رہنے کے بعد، شادی کے چالیسویں روز پھر اسی گھر میں واپس بھیج دی جاؤں اور دوبارہ باپ کی ذمہ داری اور بوجھ بن جاؤں؟''

جلال نے اس داستان میں ایرانی معاشرے میں خواتین کے ساتھ ہونے والی جنسی امتیاز و نابرابری، خواتین کا گھر کی چاردیواری میں قید رہنا، طلاق، خواتین کو باپ کے گھر میں بیگانگی و اجنبیت کا احساس کرنا اور خود کو باپ پر بوجھ سمجھنا جیسے مسایل کو روشن و اجاگر کیا ہے:

''میرے جیسی لڑکی کے لیے کہ جس نیچوتنتیس سال باپ کے گھر میں، سوائے بھائی کے کسی کو نہ دیکھا ہو اور صرف اجنبی خواتین سے بات کی ہو وہ بھی حمام یا بازار میں، یہ کیسے ممکن ہے کہ جب کسی اجنبی مرد سے ملاقات کرے اور ہاتھ و پیر گم نہ ہوں؟''

''آخر کیسے ممکن ہے کہ انسان خود کو اس عذاب کا باعث نہ سمجھے؟ کیسے انسان خود کو ایک گھر میں "فالتو" احساس نہ کرے؟''

جشن فرخنده:

جلال اس داستان میں ایسا ایرانی معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جس میں مرد مسلط و غالب، فعال، خشمگین اور حملہ آور ہوتے ہیں جبکہ در مقابل خواتین مغلوب، غیر فعال و تسلیم ہونے والی ہوتی ہیں:

''ان کی (والد) یہ عادت تھی کہ جیسے ہی مجھے یا میری ماں کو یا چھوٹی بہن، ہم میں سے کسی کو بھی دیکھتے تھے، فرمائشات شروع کر دیتے تھے''۔

"بوڑھی عورت! تو نے پھر میرے کام میں دخالت کی؟"

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں خواتین اپنے حقوق سے محروم تھیں، مرد خواتین پر غالب تھے اور ان کے ساتھ خشونت و تشدد کا برتاؤ کرتے تھے۔

نتیجه:

جلال آل احمد کا شمار، معاصر ایران کے ان مشہور مصنفین و مفکرین میں ہوتا ہے جنہوں نے حقوق نسواں کی تحریک کی حمایت کی۔ جلال کے مطابق، ایرانی معاشرے میں خواتین کی اس پسماندہ اور ذلت آمیز صورتحال کی ذمہ دار، مرد سالاری کا وجود ہے۔ آل احمد مردوں اور عورتوں کے لئے مساوی حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں اور انہوں نے اپنی داستانوں کے ذریعے معاشرے میں ان کی پسماندہ صورتحال کو اجاگر کر کے ان کی فلاح و بہبود کے لیے کوشش کی ہے۔

منابع:

.1 آل احمد، جلال، غرب زدگی، قم: نشر خرم، 1385

.2 آل احمد، جلال، سہ تار، تہران: انتشارات فردوس 1376

.3 آل احمد، جلال، زن زیادی، تہران: انتشارات فردوس 1371

.4 آل احمد، جلال، پنج داستان، تہران: انتشارات فردوس 1371

.5 اسحاقیان، جواد، سایہ ہای روشن در داستانہای جلال، تہران: گل آذین 1385.

.6 میرزایی، حسین، جلال اہل قلم، تہران: ادارہ کل تحقیق و صدا 1379

.7 حسینی، سید حسن، دشتی، منصورہ، بازنمایی کلیشہ ہای جنسیتی در رسانہ: مطالعہ ادبیات داستانی آل احمد 1391

.8 توکلی، نیرہ، فرہنگ و ہویت جنسیتی با نگاہی بر ادبیات ایران، مجلہ نامہ انسان شناسی، 1382

9 واحدی، وحیدہ سادات، سید رضایی، زری سادات، تحلیل گفتمان انتقادی داستانہای جلال آل احمد و سیمین دانشور 1395

.10 کاظمی سیمین، نواح، عبدالرضا، بررسی کلیشہ ہای جنسیتی در آثار داستانی جلال آل احمد، جامعہ شناسی ہنر و ادبیات 1393

منظور حسن (اسکالر مانو حیدآباد)

محمد قلی قطب شاہ کی عشقیہ شاعری: ایک جائزہ

دنیا کے مختلف مہذب قوموں کی طرح دکنی علماء، ادبا، شعرا، امرا اور بادشاہوں نے قدیم زمانے سے ہی حصول علم وعرفان حاصل کرنے اور اپنے قومی و اجتماعی تشخص کو بنائے رکھا۔ اگر چہ سیاسی وسماجی نظریے بدلتے رہے، ایک بادشاہت چلی گئی تو دوسری حکومت قایم ہوئی جس کا خاصا اثر دکن کے علمی وادبی حلقوں پر بھی پڑا لیکن اس کے باوجود سرزمین دکن علم وادب کی راہوں پر برقرار گامزن رہی۔ غرض دکن کی سرزمین بھمنی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی عالموں، فاضلوں اور ادیبوں کی مرکز بن گئی، سیاسی خلفشار کی بنا پر بھمنی سلطنت جب زوال پذیر ہوئی تو پانچ حصوں میں تقسیم ہوئی یعنی بیدر، برار، احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ۔ ان میں سے گولکنڈہ پر قطب سلاطین ۱۵۱۸ء سے ۱۶۸۷ء تک حکمران رہے [۱]

قطب شاہی خاندان کا بانی سلطان قلی قطب شاہ جو ترکستان کے ایک قبیلے قراقویولی سے تعلق رکھتا تھا' بھمنی عہد میں دکن آیا اور اپنی ذہانت سے کم عرصہ میں ہی دکن پر اپنی سلطنت قایم کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس خاندان کے آٹھ بادشاہوں نے یہاں حکمرانی کی ہے جن میں سے پانچواں حکمران سلطان محمد قلی قطب شاہ رہے ہیں۔ انہوں نے ۱۵۸۰ء سے ۱۶۱۱ء تک حکومت کی اور میرا یہ مقالہ اسی سلطان سے متعلق ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کی شاعری پر روشنی ڈالنے سے پہلے انکی حالات زندگی پر مختصر روشنی ڈالنا مناسب سمجھتا ہوں۔ آپ ۹۷۳ھ میں گولکنڈہ یعنی چوپان کے پہاڑ (جہاں ایک قلعہ واقع ہے) میں پیدا ہوئے۔ گولکنڈہ جو آج ایک پہاڑی قلعہ ہے سیاحوں کی سیرگا بن چکا ہے کی آبادکاری کے بارے میں علامہ اقبال یوں رقم طراز ہیں:

آہ جولانگاہ عالمگیر یعنی وہ حصار
دوش پر اپنی اٹھائے سینکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے
یہ خموشی اسکے ہنگاموں کا گورستان ہے
اپنے سکان کہن کی خاک کا دلدادہ ہے
کوہ کے سر پر مثال پاسباں استادہ ہے
کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اتر سکتی نہیں آئینہ تحریر میں
دل ہمارے یاد عہد رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں [۲]

محمد قلی اپنے والد کا تیسرا فرزند تھا اور اپنی ذہانت سے اپنے والد کے تخت وتاج کا وارث بارہ یا پندرہ سال کی عمر میں ہی ہوا۔ عزیز اللہ طباطبائی انکی تخت نشینی کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''چون آن بادشاہ حمیدہ خصال آثار انتقال از ناصہ احوال خویش نظر می فرمود شایستۂ سریر سلطنت و زیور اورنگ قطب شاہی محمد قلی قطب شاہ را کہ از سایر اولادش منفرد بود طلب فرمودہ۔۔۔۔۔اور اولی عہد خویش ساخت'' [۳]

محمد قلی قطب شاہ ایک ذہین انسان تھے۔ بچپن میں ہی سلطنت کا وارث بنا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک بے باک انسان بن گئے۔ جنگی صلاحیت بھی رکھتا تھا اور انتظامی امورات کو چلانے میں اپنے اسلاف سے کم نہ تھا۔ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا دور کسی حد تک جنگ وجدل سے دور ہی رہا۔ آپ صلح جوئی سے کام لیتے تھے لیکن بیدار مغز اور ہوشیار تھے۔ پروفیسر عبدالحمید لکھتے ہیں:

''وہ سلطنت کے بست وکشاد سے بھی غافل نہ رہا۔ وہ بہت بیدار مغز بادشاہ تھا۔ اسکی نظر سلطنت کے چاروں گوشوں پر پڑتی

تھی ۔ مسلسل شورشوں کی روک تھام ، آزادی دکن کی حفاظت ، گولکنڈے کا ہمیشہ مطمع نظر رہا۔ ۴

موصوف بادشاہ اپنے اسلاف کی طرح علوم وفنون اور شعر وسخن کا دلدادہ تھا۔انہوں نے نظام سلطنت کے ساتھ ساتھ ادبا، علما اور شعراء کی خوب سرپرستی کی۔ خاص کر میر محمد مومن استر آبادی پچیس سال تک ان کے عہد میں وکیلِ سلطنت رہے۔ سلطان محمد قلی کو ان سے خاص رغبت تھی اور اپنی تمام امور سلطنت کو انہی کے سپرد کیا۔ خود اپنی زندگی عیش وعشرت سے گزارتے رہے۔ ۵

محمد قلی قطب شاہ کی شاہانہ زندگی کا یہ عالم تھا کہ وہ بڑی رعنائیوں سے رسومات اور رواج نبھاتے تھے۔ان کی نجی زندگی اور اجتماعی زنگی نظامی گنجوی کے ہفت پیکر کے بہرام گور کے مانند ہے جو ایک سرائے سے نکلتا اور دوسری سلطنت میں سات دن رکنے کا پروگرام ترتیب دیتے ہیں اور وہاں ناچ گانے ، شباب وشراب کی محفلوں کا انعقاد کرتے ہیں۔ ان کے احوال زندگی کا مطالعہ کرنے سے جلال الدین اکبر کی شہنشاہیت اور اسکے انتظامی امورات کی یاد بھی تازہ ہوتی ہے۔ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

''عظیم الشان اور آراستہ دربار، فلک بوس محلات، پُر شکوہ عمارتیں اور پُر لطف سماجی وعلمی محفلیں محمد قلی قطب شاہ کے پاکیزہ ذوق اور نفیس طریقۂ بود وباش کی شاہد ہیں۔ بادشاہ ہاتھی پر باہر نکلتا۔ امرا اور وزیر گھوڑوں اور پالکیوں میں موجود ہوتے۔ شیشے اور بلور کی آرائشی اشیاء، سونے اور چاندی کے ظروف اور قیمتی قالین اور فاجرہ لباس سے محمد قلی قطب شاہ کی خوشحالی کا ثبوت ملتا ہے۔'' ۶

محمد قلی قطب شاہ ایک سخن سنج اور ادب نواز حکمران ہونے کے ساتھ ساتھ فن تعمیر میں بھی شہرت خاص رکھتا تھا۔انہوں نے حیدر آباد شہر کی بنیاد رکھی ۔ چار مینار جو عصر حاضر میں بھی ہزاروں سیاحوں کیلئے باعث کشش اور تفریح ہے، اسی بادشاہ کا تعمیر کردہ ہے۔ اسکے علاوہ چار مینار کے قرب وجوار میں شاہی محل تعمیر کروائے۔ شہر میں بے شمار مساجد، خانقاہیں ، عاشور خانے ، مہمان خانے ، مدرسے اور کاروان سرائے بنوائیں۔کئی محلات جیسے حیدر محل، سجن محل، حنا محل، محل کوہ طور، خداداد محل، دولت خانہ، دکانیں، دواخانے، پل اور باغات وغیرہ قطب شاہی دور میں تعمیر ہوئے۔ میر سعادت علی رضوی انکے کارناموں کو مختصراً یاد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اسی بادشاہ نے موجودہ شہر حیدر آباد کی بنیاد ڈالی اور چار مینار کی سی عظیم الشان عمارت اپنی یادگار چھوڑی۔اس کے زمانے میں گولکنڈہ علما، فضلا وشعرا کا مرجع بن گیا تھا''۔ ۷

عیش وعشرت کی عادت نے اسے اپنے صحت سے غافل رکھا۔ وہ کمزور ہوتا گیا اور آہستہ آہستہ بیماریوں کا شکار بھی ہوا لیکن اپنی وضع سے قطع نظر نہ ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ بالآخر وہ تپ میں مبتلا رہ کر دواڑھائی مہینے بستر مرگ پر لیٹا رہا اور پھر داعی اجل کو ۱۶۱۱ء میں لبیک کہہ گئے۔ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

''اس کی عیش وعشرت کی زندگی نے اسکی صحت پر بُرا اثر ڈالا اور اسکی رندی اور بے باکی نے اس کو اپنی صحت سے ہمیشہ لاپروا رکھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کثرت عشرت اور شراب نوشی کی وجہ سے وہ کمزور ہو گیا۔ ۸

محمد قلی قطب شاہ کی عشقیہ شاعری

محمد قلی قطب شاہ ایک ہندوستانی سوچ یعنی سیکولر سوچ رکھنے والا ایک عشرت پسند اور آزاد بادشاہ رہے ہیں۔وہ مصوری کو پسند کرتا تھا اور تصویروں کا دیوانہ بھی تھا۔وہ خطاطی اور خوش نویسی میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ شاعرانہ طبیعت کا مالک تھا اور اپنی شاعری میں محض ایک عاشقانہ شاعر نہ تھا۔وہ ہمہ جہت اور ہمہ گیر بادشاہ تھا اور قدرتی خوبصورتی سے مسرور اور شادمان ہوتا تھا۔وہ شراب پیتے تھے اور جب ہوش سنبھالتے تو اپنے کردار میں تغیر وتبدل پیدا کرتے تھے۔وہ مست رہتے اور مستی سے جینے کا سلیقہ جانتے تھے۔وہ ایک بے باک عاشق اور رعنائیوں کا شیدائی تھا۔اپنے عہد کے سب سے بڑے سہ لسانی شاعر بھی تھے۔آپ نے دکنی اردو، فارسی اور تیلگو زبان میں اپنا کلام چھوڑا ہے۔ محققین کا ماننا ہے کہ انکے مجموعہ کلام کا کوئی پیشہ ور شاعر بھی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ رفعت سروش انکی محبوبہ کے انداز زندگی اور عاشقانہ رعنائیوں کی تصویر کشی ان اشعار میں کرتے ہیں۔

''اُٹھی تاریخ کے اوراق سے رقاصۂ چنچلم

چھنا چھن چھن
تغیر اور تمدن کا نیا آہنگ تھا اس میں
وہ اک فنکار تھی، تصویر تھی حسن ومحبت کی
ادائے دلربائی تھی نگاہوں میں
بہت مقبول تھی وہ کج کلاہوں میں
وہ تھی اک ایسی رقاصہ
بشارت جس نے دی اک عہد نو کی
گردشیں اس کی
زمانے کو نیا انداز دیتی تھیں
پس پردہ تھے جو منتظر، آہیں آواز دیتی تھیں
لب موسیٰ پہ تھا اسکا محل
اک نقش تھا اوراق ہستی پر
بنام چار مینار
اسکی رفعت اور عظمت کا ہے جو شاہد"9

رفعت سروش نے بھاگ متی کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ نہایت ہی پرلطف اور نرالا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کا محبوب محسن فانی اور ظفر خان احسن کا مشترکہ محبوب نہیں، بلکہ یہاں نوبت ایسی ہے کہ تم نے پکارا اور ہم چلے آئے۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ شاعر خود منصب حکومت پر فایز تھے۔ محمد قلی قطب شاہ نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور چونکہ ان کا دل اثر لینے والا دل تھا وہ دل کی باتیں زیادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ صرف ایک شاعر نہ تھے بلکہ وہ ناقدانہ رائے قایم کرتے اور مولویوں اور زاہدوں پر تنقید بھی کرتے۔ وہ سنسکرت علوم پر بھی نظر رکھتے تھے۔ اپنی سلطنت چلانے کے ہنر سے بھی واقف نظر آتے۔ انہوں نے اردو میں معانی اور فارسی میں قطبشہ تخلص اختیار کیا۔ آپ کی ہمہ گیر طبیعت نے صرف غزل اور قصیدے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مقامی اور معاشرتی حالات و واقعات کو بیان کرنے کیلئے چھوٹی چھوٹی نظمیں، قطعات اور رباعیات بھی کہی ہیں۔ عشق آپ کا ایک خاص موضوع رہا ہے جو آپ کی کلیات پر زیادہ تر چھایا ہوا ہے۔

با شمع مگو گرمی دیوانۂ خود را
کآتش زند از رشک تو پروانۂ خود را
ہوش و خرد از پای در افتد چو مستان
چون سرمہ کشی نرگس مستانۂ خود را
مستان محبت بہ دو عالم نہ فروشند
کیفیت تہ جرعۂ پیمانۂ خود را
با یاد تو عاشق نہ کشد منت خورشید
بستیم درِ روزنۂ خانۂ خود را

گر جملہ جہان پر شود از گوہر یکتا
خواہیم ہمان گوہر یک دانۂ خود را
دل در غم او یافتہ صد جنت پنہان
چون عذر بخواہم غم جانانۂ خود را
ای قطبشہ آخر رہ مردان رہ عشق است
مردانہ ہستی رو رہ مردانۂ خود را10

محمد قلی قطب شاہ کی عشقیہ شاعری ان پری چہروں اور حسن وغمزہ والی محبوبوں کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے جنہوں نے ان کی رقص وسرود کی محفلوں میں ان کا دل لبھایا ہے۔ جن سے وہ از حد متاثر اور سرشار نظر آتا ہے۔ گرد و پیش کے اس ماحول نے اس من چلے عاشق مزاج بادشاہ کو مزید عیش کوشی اور عشرت انگیزی میں دھکیل دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کو اپنے عیش پسند مزاج سے انصاف کرنے کا پورا پورا موقع ملا۔

من غم عالم نہ دارم   عاشقی کار من است
پادشاہ کشور عشقم   خدا یار من است
چون محمد قطبشہ   از عشق می گوید سخن
عاشقان را آرزوی   طرز گفتار من است

......

ملک محبت کہ داد خواہ نہ دارد
ملک چنین ہیچ بادشاہ نہ دارد
گر ہمہ عمرم نظر بہ روی تو باشد

دیدہ بجز حسرت نگاہ نہ دارد
منکر زاہد نہ یم وزہد و لیکن
دل سرو پروای خانقاہ نہ دارد
گو سپہ انگیز درد و غم بہ سر ما
مرد محبت غم از سپاہ ندارد
بین کہ چہ طوفان آتش است ز عشقش
آئینہ دل کہ تاب آہ ندارد
تکیہ گہہ قطبشاہ چون دگران نیست
جز کرم دوست تکیہ گاہ ندارد[11]

عشق نے محمد قلی قطب شاہ کو اس قدر اندھا کر دیا تھا کہ وہ قرآنی آیتوں کو بھی طنزیہ پیرائے میں مشکوک زاویے سے دیکھتا ہے۔ وہ اپنی شاہانہ وضع پر ناز کرتا نظر آتا ہے۔ ہاں اگر کبھی اسے اپنے محبوب سے دل بھی دکھتا ہے تو وہ اسے بھی محبت اور دوستی کے عوض فراموش کئے دیتا ہے۔ وہ اپنی محبوب سے شکایت کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔

در آن وادی کہ آتش می شود گلشن در آزاہد
ہزاران جنت است اینجا چرا دوری ازین وادی
بہ ملک عشق از سدِ سکندر کس نمی گوید
درین ملک مبارک رہ ندارد ست بنیادی
خرابی ہا کہ دل از ترکتاز غمزہ دارد
فدای آن خرابی باد معموری و آبادی
دلی کز دوست نالان شد پریشان گشت و حیران
مسلمان مبادا ہیچکس از دوست فریادی
غم یاری کہ در دل قطبشہ دارد عجب نبود
گر از خاک درش سر بر ندارد یک نفس شادی[12]

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کے مجموعی موضوعات عشق کے علاوہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت ہے۔ وہ درباری رسومات سے بھی متاثر ہوتا ہے اور اس پر بھی شعر کہتا ہے اور عورتوں کے لباس اور خوبصورتی سے بھی اثر انداز ہوتا ہے اور انکی تعریف میں مرقع کشی کرتا ہے۔ وہ قدرتی خوبصورتی سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے اور پھولوں کی مہک سے بھی جھومتا نظر آتا ہے۔ وہ ایک خوش لحن عاشقانہ شاعر ہے جس کے اندر وسعت فکر بھی ہے اور نظر بھی۔ وہ محلوں کو بھی سجاتا ہے اور انکے اندر رہنے سے بھی محظوظ ہوتا نظر آتا ہے۔ شاعر اپنی ندرت انداز سے موسموں کے ہواؤں سے بھی حظ اٹھاتا ہے اور فصل بہار کی رعنائیوں میں بھی شراب اور شباب کا خواستگار ہے۔ وہ بہار میں بھی کاسۂ لال سے شراب کے گھونٹ پی کر خمار میں رہنا پسند کرتا ہے۔

ساقی بیا رباده کہ فصل بہار شد
صحن چمن ز آب و ہوا لالہ زار شد
ما اقتدا بہ شراب مدام تو کردہ ایم
پُر کن پیالہ کہ زمان خمار شد
چشم فلک زرشک مقیمان بزم تو
چون دیدہ صراحی می اشکبار شد
ہر جرعۂ ززہر غضب نوش کردہ ام
از دست آن نگار مرا ساز گار شد
کردیم از رقیب نہان راز دل چہ سود
زآن نگاہ راز مرا آشکار شد
اکنون کند کنارہ زمن ناصحا چو دید
کین صید دل بہ دست غم او شکار شد
بر وعدہ وصال دلش خوش کن ای حبیب
چون قطبشہ زہجر رخت بی قرار شد[13]

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری میں ہمیں عشق اور مناظر قدرت کی عکاسی کے علاوہ کھیل کود اور لہو ولعب کی مدح میں بھی نظمیں ملتی ہیں۔ انہوں نے کھمنڈی، کولانٹ، ناٹک، پھوکڑی پھو وغیرہ کھیلوں پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ اسکے علاوہ انہوں نے تہواروں کا نقشہ بھی کھینچا ہے اور اسلام میں منائے جارہے مختلف تہوار، شب اور ماتم جیسے شب برات، عید میلاد، محرم، عید بکر اور عاشورہ وغیرہ موقع پر بھی اشعار کہے ہیں۔ انہوں نے خوبصورت باغوں، پھلوں اور قدرتی نظاروں کی بھی عکاسی اپنی شاعری میں جا بجا کی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے ادبی اصناف جیسے غزل، قصیدے،

رباعیاں، نظم اور مرثیوں میں بھی خاصا کلام باقی چھوڑا ہے۔ میں یہاں پر انکا ایک مرثیہ بند بطور شاہد کے نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

امروز روز ماتم سلطان کربلا است
روح الامین زخاک نشینان کربلا است
شاہنشہی کہ فخر زمین و زمانہ است
درخاک وخون فتادہ میدان کربلا است
فریاد العطش زدن تشنگان ہنوز
در گوش وحش وطیر بیابان کربلا است
ای جن وانس خاک ندامت بست کنید
کامروز روز قتل سلیمان کربلا است
شیون فتادہ در دل ذرات کن فکان
خورشید ہم زتعزیہ داران کربلا است ۱۳؎

بہر حال مقالے کو طوالت کے خوف سے میں یہاں رفعت سروش کی ایک آزاد نظم سے اختتام کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے محمد قلی قطب شاہ کے احوال پر دقیق غور کرنے کے بعد تحریر کی اور اس غزل میں بادشاہ کی شبیہ کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جس طرح بادشاہ خود خوش نویسی کا شیدائی تھا ٹھیک اسی طرح مناسب اور ترنم ساز الفاظ کا انتخاب کر کے تصویر کشی کی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

چھن چھن چھن
گزرے اس کو چار سو سال
نام تھا اسکا بھاگ متی
آج نگاہِ تصویر سے
دیکھ رہا ہوں یہ منظر
رقص اور شعر ہیں ہم آغوش
بیچ نہیں دیوار کوئی
قلی قطب شہزادہ ہے

مسکن گولکنڈہ اسکا
آندھی ہو یا طوفان ہو
دریا میں طغیانی ہو
گر شہزادے کے دل میں
پیار ہو اور جولانی ہو
روک نہیں سکتی اسکو
طوفان کی موجیں بھی
لہروں کی زنجیریں بھی
سچے پیار کے پیروں میں
ڈال نہیں سکتا کوئی
جھوٹی عظمت کی زنجیر ۱۴؎

منابع

۱۔کلیات محمد قلی قطب شاہ از ڈاکٹر سیدہ جعفر نشر قومی قونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی ص ۱۷
۲۔یادگار یوم محمد قلی قطب شاہ ص ۱۱
۳۔کلیات محمد قلی قطب شاہ از ڈاکٹر سیدہ جعفر نشر قومی قونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی ص ۳۰
۴۔تاریخ گولکنڈہ از پروفیسر عبدالحمید صدیقی ص ۱۱۳
۵۔تاریخ فرشتہ ترجمہ عبدالحی خواجہ جلد دو ناشر مکتب ملت دیو بند یوپی ص ۴۷۴
۶۔کلیات محمد قلی قطب شاہ از ڈاکٹر سیدہ جعفر نشر قومی قونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی ص ۶۴
۷۔کلام الملوک مرتبہ از میر سعادت علی رضوی ۱۳۵۷ھ شمارہ ۳ ص ۴۴
۸۔دیباچہ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ مرتبہ از ڈاکٹر زور ص ۳۱۷
۹۔اردو ادب۔ رسالہ سہ ماہی ایڈیٹر اسلم پرویز ناشر انجمن ترقی اردو ہند۔ نئی دہلی۔ ص ۲۱۴۔۲۱۵
۱۰۔کلام الملوک مرتبہ از میر سعادت علی رضوی ۱۳۵۷ھ شمارہ ۳ ص ۴۷
۱۱۔کلام الملوک مرتبہ از میر سعادت علی رضوی ۱۳۵۷ھ شمارہ ۳ ص ۴۸
۱۲۔کلام الملوک مرتبہ از میر سعادت علی رضوی ۱۳۵۷ھ شمارہ ۳ ص ۵۴
۱۳۔کلام الملوک مرتبہ از میر سعادت علی رضوی ۱۳۵۷ھ شمارہ ۳ ص ۵۳
۱۴۔اردو ادب۔ رسالہ سہ ماہی ایڈیٹر اسلم پرویز ناشر انجمن ترقی اردو ہند۔ نئی دہلی۔ ص ۲۱۶

عائشہ صدیقہ۔جے (ریسرچ اسکالر، شعبہ عربی، فارسی واردو مدراس یونیورسٹی، چینئی)

کورونا وائرس غور وفکر کے چند پہلو

کورونا وائرس کے متعلق بہت سے حقائق جاننا ہر ایک فرد کیلئے انتہائی اہم ہے، کورونا وائرس کیا ہے؟ کیسے پھیلتا ہے؟ اس سے حفاظت کی کیا شکلیں ہیں؟ وائرس کس حد تک نقصان دہ ہے اس مضمون کے تحت معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

کورونا لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی تاج یا ہالہ کے ہوتے ہیں۔ چونکہ اس وائرس کی ظاہری شکل سورج کے ہالے یعنی کورونا کے مشابہ ہوتی ہے، اسی وجہ سے اس کا نام " کورونا وائرس" رکھا گیا۔ کورونا وائرس ایک بہت پرانا وائرس ہے جو 1930 میں مرغیوں میں دریافت ہوا، اور پھر 1940 میں چوہوں میں دریافت ہوا۔ انسانوں میں کورونا وائرس سب سے پہلے 1960 کی دہائی میں دریافت ہوا، یہ سردی کے نزلہ سے متاثر کچھ مریضوں میں خنزیر سے متعدی ہوکر داخل ہوا تھا۔ اس وقت اس وائرس کو انسانی کورونا وائرس E229 اور OC42 کا نام دیا گیا تھا اس کے بعد اس وائرس کی دوسری قسمیں بھی دریافت ہوئیں۔

عالمی ادارہ صحت کے ذریعہ نامزد کردہ nCov-2019 نامی کورونا وائرس کی ایک نئی وبا 31 دسمبر 2019 سے چین میں عام ہوئی جو آہستہ آہستہ وبائی شکل اختیار کر چکی ہے۔ حالیہ 2019 میں دریافت ہونے والے کورونا وائرس کو SARS-CoV-2 یا COVID-19 کا نام دیا گیا، یہ وائرس اس لیے خطرناک ہے کہ یہ انسان سے انسان کے درمیان میں پھیلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وسطی چین میں واقع ووہان کے چار باشندے 26 دسمبر 2019 کو بخار، کھانسی اور سانس لینے میں تکلیف کی شکایت لے کر ڈاکٹر ژھینگ جکسیان کے پاس پہنچے، ڈاکٹر ژھینگ نے ان مریضوں میں ایک پراسرار قسم کے نمونیہ کی دریافت کی، ان ہی دنوں ووہان سنٹرل ہاسپٹل کے ڈاکٹر لی وینلیانگ نے سوشل میڈیا کے ذریعہ لوگوں کو ایک نئے وائرس سے خبردار کیا۔ 25 جنوری 2020 کو چین کے 13 شہروں میں ایمرجنسی لگا دی گئی ہے جبکہ وائرس کی شناخت یوروپ سمیت کئی دوسرے ممالک میں بھی ہو چکی ہے۔

کورونا وائرس کی عمومی علامت بخار، تھکاوٹ اور خشک کھانسی ہیں۔ کورونا وائرس کی عام علامت میں نظام تنفس کے مسائل (کھانسی، سانس پھولنا، سانس لینے میں دشواری)، نزلہ، نظام انہضام کے مسائل (اسہال اور الٹی) اور جسمانی تھکاوٹ اس میں شامل ہیں۔ شدید نمونیہ کی انفیکشن کے سانس کی تکلیف جو بعد میں موت کا سبب بن جاتی ہے۔ عموماً اس وائرس کے اثرات معمولی اور خفیف ہوتے ہیں، لیکن بعض اوقات کسی غیر معمولی صورت حال میں مہلک بھی ہوجاتے ہیں، اس کے علاج یا روک تھام کے لیے اب تک کوئی تصدیق شدہ علاج یا دوا دریافت نہیں ہوسکی ہے۔

آج کورونا وائرس چین، امریکہ، اٹلی، اسپین، آسٹریلیا و جنوبی کوریا سمیت کئی ممالک سے ہوتا ہوا بالآخر ہندوستان کے کئی ریاستوں کو متاثر کر چکا ہے۔ کورونا وائرس کا کیس رپورٹ درج ہونے کے بعد ملک بھر میں لاک ڈاؤن

نافذ کر دیا گیا ہے، سماجی رابطہ کے ذریعہ آسانی سے لوگوں کو متاثر کر سکتا ہے، روک تھام کے لیے لاک ڈاؤن کر دیا گیا ہے، لوگوں کو گھروں تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اب تک دنیا بھر میں 210 ممالک کورونا کا شکار ہو چکے ہیں۔ ہندوستان بھر میں تقریباً 9,635 سے زائد لوگ اس وائرس کا شکار ہو چکے ہیں، بالخصوص صوبہ تملناڈو میں آج تک 1,173 سے زائد لوگ اس وائرس کا شکار ہو چکے ہیں جن میں 11 لوگ زندگی سے ہار بیٹھے۔ اس وبا کو جہاں تک ممکن ہے روکنے کی ذمہ داری ہم سب کی ہے۔ جہاں کورونا وائرس کے متعلق اس حد تک ڈر اور خوف پھیلا دیا گیا وہیں طبّی ماہرین کے نزدیک یہ بات بھی حقیقت مانی جاسکتی ہے کہ کرونا وائرس اس حد تک جان لیوا نہیں ہے جیسا کہ افواہیں پھیلا رہے ہیں۔ کورونا وائرس کا کوئی خاص تصدیق شدہ علاج یا دوا نہیں البتہ چند احتیاطی تدابیر بتائی جاتی ہیں:

☆صابن یا سانیٹائزر سے بار بار ہاتھ دھوتے رہیں۔

☆گندے ہاتھوں سے ناک، آنکھ اور منہ کو چھونے سے گریز کریں۔

☆ایک دوسرے سے ہاتھ نہ ملائیں۔

☆متاثرہ افراد سے براہ راست اور ان کی استعمالی چیزوں سے دور رہیں۔

☆کمرے و مکان کے اندر سورج کی روشنی پہنچنے دیں۔

☆کھانستے یا چھینکتے وقت منہ کو رومال سے ڈھکیں۔

☆متوازن اور مقوی غذا، صاف اور گرم پانی کا استعمال کریں۔

☆اگر طبیعت خراب محسوس ہو تو گھر میں رہیں۔ اگر بخار، کھانسی یا سانس لینے میں دشواری ہو تو فوری طبی مدد حاصل کریں، طبی حکام کی ہدایت پر عمل کریں۔

جلیل نظامی (حیدرآباد)

کرونا وائرس

لا دوا مرض کو کہتے ہیں کرونا صاحب
کارگر جس پہ نہ جادو ہے نہ ٹونا صاحب
دل میں ارمان نہیں ' اس کا ہے رونا صاحب
ورنہ مشکل تھا کسے؟ ہاتھوں کو دھونا صاحب
جانتا کوئی نہیں کون ہے یہ دشمن جاں
لوگ کہتے ہیں اسے چینی کھلونا صاحب
تیز رفتار ہے اتنا کہ نظر سے پہلے
جا پہنچتا ہے جہاں دل کا ہے کونا صاحب
بھیڑ میں گھس کے یہ کرتا ہے مریضوں پہ "اٹیک"
لوگ فٹبال ہیں اور یہ مراڈونا صاحب
ظلم " کووڈ" کا ہو' سنگھی ہو' کہ "اسرائیلی"
ایک جیسا ہے کسی سے بھی ڈرو نا صاحب
کشتیاں سب کی کنارے پہ پہنچ جائیں گی
ہے ہوا تیز تحمل سے بہو نا صاحب
ہے علاج اس کا فقط ایک سماجی دوری
فاصلہ رکھ کے ملاقات کرو نا صاحب
موت برحق ہے کسی حال میں آسکتی ہے
حوصلہ ہار کے بے موت مرو نا صاحب
قربتیں شدت جذبات کچل دیتی ہیں
دھیان میں رکھ کے بصد شوق ملونا صاحب
مانع دشت نوردی سگ لیلی تو نہ تھا
خود چنا قیس نے اپنے لیے کونا صاحب
درودیوار میں پیوست ہے سب دیدہ وری
کوئی آنکھوں کے لیے سپنا سلونا صاحب
آپ کے پنجے میں خود آگئی ساری دنیا
سیر دنیا کی کرو گھر میں رہو نا صاحب
تشنگی چشم تصور کی بجھے کیسے؟ جلیل
شربت دید سے یہ پیالہ بھرونا صاحب

محمد زاهد ناصری القاسمی (حیدرآباد)

پیامِ سعیدؒ

وقت کے قدردان، مفسر قرآن، دین متین کے ترجمان، درجنوں کتابوں کے مترجم، شارح اور مؤلف، کوہ استقامت کے پیکر، وسیع المطالعہ، کثیر التجربہ اور گفتار وکردار کے غازی استاذی واستاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری رحمہ اللہ (شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند) کی وفات یقیناً ''مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ'' کا مصداق ہے، ان کا انتقال ہم جیسے زندوں کے لیے بہت بڑے اور نا قابل تلافی نقصان کا باعث ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، مگر اپنے روشن نقوش حیات کی وجہ سے اپنے چاہنے والوں اور قدردانوں کے ذہن ودماغ میں ابھی بھی موجود ہیں اور آثار وقرائن یہ بتا رہے ہیں کہ وہاں سے ان کی وداعی مشکل ہی نہیں، ناممکنات میں سے ہے، جو لوگ مر کر بھی زندہ رہیں اور بالواسطہ ان کا فیض جاری رہے، ان کے حق میں ان کی موت بھی عام لوگوں کی زندگی سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔

حضرت علیہ الرحمہ بلاشبہ اسم بامسمی تھے، انھوں نے علوم اسلامیہ میں کمال حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ، ان کی تاحیات خدمات اور اپنی باعمل زندگی کے ذریعے یہ ثابت کر دیا تھا اور ملت اسلامیہ نے قبول بھی کر لیا تھا کہ واقعتاً وہ سعید تھے اور صحابی رسول حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مبارک فرمان ہے: ... ''مَا رَاٰی الْمُسْلِمُوْنَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ حَسَنٌ''...(مسند احمد، حدیث نمبر:3600) "مسلمانوں کا سواد اعظم جسے اچھا سمجھے وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہی ہوتا ہے۔"

ماہ مبارک میں سفر آخرت پر روانگی کا واقعہ، نیز ان کی وفات پر پوری دنیا میں مسلمانوں کی جانب سے اظہار غم اور عرب وعجم کے شیوخ اور قائدین کی طرف سے تعزیتی پیامات مسنونہ، یہ سب عند اللہ ان کے مقبول اور سعید ہونے کی علامات ہیں۔

اللہ پاک نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے:" وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ"...(سورہ ہود:108)" جو لوگ سعید اور نیک بخت ہوں گے وہ جنت میں رہیں گے۔" لہذا مجھے خدائے رحمان سے قوی امید ہے کہ حضرت الاستاذ بھی خالق ومخلوق کی نظر میں سعید اور نیک ہونے کی وجہ سے ان شاءاللہ جنت الفردوس میں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی رفاقت میں دائمی عیش وعشرت میں ہوں گے۔

حضرت علیہ الرحمہ کی مخلصانہ اور مثالی زندگی ہمیں اور ہماری نئی نسل کو یہ پیغام دیتی ہے کہ ہم بھی اپنی زندگی کی قدر وقیمت کو پہچانیں، اپنے وقت کی حفاظت کریں، سعی وکوشش کو اپنا شعار بنائیں اور علم وہنر میں کمال حاصل کر کے دنیا وآخرت میں سرخروئی کے مستحق بنیں؛ تا کہ ہم ان کی طرح مرنے کے بعد بھی زندوں کے لئے نمونہ عمل بنے رہیں!

اللہ تعالیٰ حضرت کی مغفرت اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے، نیز ہمیں بھی اپنی رضا کے تابع بنا دے اور ایمان پر حسن خاتمہ نصیب فرمائے، آمین.

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

عطیہ نفیس (حیدرآباد)

فیض احمد فیض: شخصیت وشاعری

نام: فیض احمد
تخلص: فیض
۱۹۱۱ء سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔
دادا کا نام، سائب زاد تھا، پردادا کا نام سربلند خاں

آپ کے آبا و اجداد افغانستان، پٹھان خاندان سے تھے، والد کا نام سلطان بخش تھا، بعد میں سلطان محمد خان رکھا، والدہ کا نام، فاطمہ تھا آپ کی پہلی والدہ کے انتقال کے بعد والد نے دوسرا نکاح کیا آپ دوسری والدہ کی اولاد میں سے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں اسکول میں داخلہ لیا، ۱۹۲۷ء میں میاٹرک ۱۹۳۱ء بی اے، ۱۹۳۳ء ایم اے انگریزی لاہور سے کیا۔ آپ کو طالب علمی کے زمانے سے ہی پڑھائی اور شعر وشاعری میں دلچسپی تھی، طالب علمی کے زمانے میں کئی ساری نظمیں لکھیں جو کالج کے میگزین میں شائع ہوئیں، فیض احمد فیض ایک انگریزی خاتون ایلس جارج سے اسلامی طریقہ سے شادی کی، شادی کشمیر میں ہوئی نکاح شیخ عبداللہ نے پڑھایا ،۱۹۴۰ء میں مہاراج محل میں نکاح ہوا، جوش اور مجاز بھی اس تقریب میں موجود تھے۔ فیض کے والد نے ایلس جارج کا نام نکاح کے بعد کلثوم رکھا، فیض کی دولڑکیاں، ۱۹۴۲ء بڑی لڑکی سلیمہ، دوسری لڑکی ۱۹۴۵ء منیرا تھیں۔ آپ کے دوستوں میں اقبال، جوش، مجاز، سید سلیمان ندوی تھے۔ فیض ۱۹۳۵ء مسلم اینگلو اورینٹیل امرتسر کے مسلم اورینٹر کالج میں لکچرار، ۱۹۴۰ میں لاہور کے ہیلی کالج میں انگریزی کے استاد مقررہ ہوئے، فیض احمد فیض پہلے ایشیائی شاعر تھے، جنہیں لینین آوارڈ سے بھی نوازا گیا، ابتداء میں شاعری کا موضوع مجازی عشق تھا، فیض عشق مجازی کے طرز اسلوب کو اپنائے ہوئے تھے لیکن جب تحریک ہوئی تو تحریک میں حصہ لیا ، مزدوروں غریبوں کی آہ ان کو اتنا چھوگئی کہ ہمیشہ کے لئے اسی طرز اسلوب کو اپنائے رکھے، خوب لکھا خوب سے خوب طر انداز میں لکھا، جس کی بہترین مثال ان کی نظم مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نا مانگ ہے، جس میں ان کے شاعری کا پہلا اسلوب اور بعد والا اسلوب ملتا ہے۔

فیض احمد فیض شعر کو تراش قراش کر سامنے لاتے ہیں۔ فیض صحافت سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے پاکستانی ٹائمز نامی اخبار بھی جاری کیا، اس کے علاوہ انگریزی اخبار روزنامہ سے وابستہ رہے، اور ایڈیٹر بھی رہے۔ فیض جب تحریک سے وابستہ ہوکر جو نظمیں لکھیں وہ نظمیں جوش ولولہ دیلانے کا کام کرنے لگی، جس کی پاداش میں کئی دفعہ انھیں جیل بھی جانا پڑا۔ دو سال میں تین دفعہ جیل گئے، ترقی پسند تحریک خطابیہ شاعری کا مطالبہ کرتی تھی، لیکن حالات کے تقاضے سے مجبور ہوکر فیض کو ایسی شاعری بھی کرنی پڑی جس میں براہ راست تخاطب تھا، شعریت کم تھی سیاسی لیڈر کے نام، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، ایرانی طلبا کے نام، زرد کتے ایسی ہی نظمیں ہیں۔ یہ شاعری کم ہیں، پروپیگنڈہ زیادہ، کچھ نظموں میں پیوند کاری ہے، جیسے شیشوں کا مسیحا، میرے ہمدم

میرے دوست، لیکن سچا شاعر کیسے اپنے اصلی رنگ کو دبائے رکھ سکتا ہے، انھوں نے اشارے کنائے کا سہارا لے کر اپنی مخصوص انداز کی شاعری کی، ہم لوگ، صبح آزادی، تنہائی، دریچہ، ایسی لافانی نظمیں ہیں، جس میں شاعری ادبی ڈکٹیٹروں کی پروا کئے بغیر اپنے انداز کی شاعری کی ہے، اور لازوال تخلیقات پیش کی ہیں، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ فیض کی شاعری میں اظہار خیال پر پہرے بیٹھا دیئے گئے، تو انھوں نے کہا..!!

متاعِ لوح وقلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہرایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ان کے کلام میں ندروت اسلوب نظر آتا ہے، فیض احمد فیض شعر کو تراش قراش کر سامنے لاتے ہیں، انھوں نے زرد کتا، نامی نظم انگریزوں کے ظلم وستم کا بدلہ لینے کے حوالے سے لکھا، جو بہترین نظموں میں سے ایک ہے، ابتداء میں فیض رومانی شاعری کیا کرتے تھے، جب ترقی پسند تحریک سے جڑ گئے تو انقلابی شاعری کو ترجیح دی، فیض احمد فیض کا شمار ترقی پسند تحریک کے اہم بانیوں میں سے ایک ہے، انہوں نے غزل کی روایتی علامتوں کو عہد حاضر کے سیاسی پس منظر میں نیا مفہوم عطا کیا، آپ کا کلام تمام تر مزدوروں اور کچلے ہوئے طبقوں کی حمایت میں لکھا گیا ہے۔

بقول ڈاکٹر مسعود حسین خاں:

"فیض کی نظم' مجھ سے پہلے سی محبت میری محبوب نا مانگ، شاعری میں دو قسم کی تبدیلیاں ہیں، جمالیات اور ایک رومان، کا حسن نظر آتا ہے۔"

عشق کا سیلاب وقت بیتنے کے ساتھ گزر گیا، ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوگیا شعر کہنے کے لئے نیا محرک ہاتھ آ گیا، ان کے نظموں میں زیادہ تر حالات سے مایوس ہونے کے بجائے حالات میں تبدیلی لانے کی طرف گامزان کر ہوئی، ترقی پسند تحریک میں مظلوموں کی حمایت کے نعریوں میں ایسی کشش تھی، کہ فیض پوری طرح اس کے ہم نوا ہو گئے، فیض نے اپنا غم بھولانے کے لئے دنیا کے غم کو گلے لگایا، نظم مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ اُس زمانے کی یادگار ہے، اس نظم کا ایک شعر ہے۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

آپ کے شعری مجموعات

نقش فریادی (۱۹۴۱)، دست صبا (۱۹۵۲)، زنداں نامہ (۱۹۵۶)، میرے دل میرے مسافر، نسخہ ہائے وفا، شعری مجموعہ۔

کلام فیض، دس تہہ سنگ (۱۹۵۶) سروارئے سینہ (۱۹۷۱)، شام شہر یاراں (۱۹۷۸)، میرے دل میرے مسافر (۱۹۸۱)، کلام فیض، سارے سخن ہمارے، اس کے علاوہ آپ نے سفر نامہ کیوبا لکھا، مطالق وقلب، ہماری قومی سخاوت نثری مجموعہ، میں و سال آشنائی نثری مجموعہ، صلیب میرے دریچہ میں (۱۹۷۲)، نثری مجموعہ۔

نظمیں:۔ مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نا مانگ، شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، نثار میں تیری گلیوں کا اے وطن کے جہاں، ڈرامے: سانپ کی چھتری، تماشا میرے آگے، پرائیوٹ سکریڑی۔ فیض کے کلام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے شعروں میں دلکش ترنم پایا جاتا ہے، پیکر تراشی میں انھیں بڑی مہارات حاصل ہے، آپ میر وغالب کے ہم پلہ نہ سہی مگر وہ ہمارے عہد کے ایک نامور شاعر ہیں، پر لطف تشبیوں اور استعاروں سے وہ جیتے جاگتے پیکر تراشتے ہیں، چند اشعار

ملاحظہ ہو۔

تم آئے ہو، نہ شب ِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے
چمن میں غیرتِ گل چیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار، گزری ہے
درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے ابھرنے لگتے ہیں

برحال ترقی پسند تحریک کے جو نتائج برآمد ہوئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ادب میں حسن کاری پر توجہ کم ہوگئی۔

حقیقت نگاری کو فروغ ہوا ادب کی افادیت پر زور دیا گیا، موضوعات کا دائرہ وسیع ہوا۔ ادب عوام کی امنگوں کا ترجمان بنی، اب ادب صرف مسرت حاصل کرنے اور وقت گزارنے کا ذریعہ نہ رہی بل کے زندگی کو سنوارنے اور بہتر بنانے کا وسیلہ بن گئی، لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کے ادب جب ادب نہ رہ کر نعرہ بازی بن گی، پھر اس کا زوال شروع ہوگیا، فیض کے پاس بے انتہا وطن کے لئے محبت وفراق میں تڑپنا نظر آتا ہے۔ برسوں قید وبند کی زندگی گذاری، کئی تکلیفیں صبح اور آخر کار ۱۹۸۴ء میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے، آپ کا آپنے وطن سے بے انتہا محبت رکھنا ہی ہے جو آج تک آپ کا نام زندہ جاوید ہے، اور ہمیشہ سر فہرست بھی رہے گا.....!!

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد (ملک پیٹ)

لڑکیوں کی اعلیٰ دینی وعصری تعلیم کا فکری واصلاحی معیاری مرکز

شعبہ جات: تحفیظ القرآن الکریم ★ شعبہ ابتدائیہ (دوسال) ★ شعبہ عالمیت (چارسال) ★ شعبہ فضیلت (دوسال)

☆شہر سے اہم مقامات سے آمد ورفت کی سہولت ☆دور دراز کی طالبات کے لیے ہاسٹل کا نظم ☆عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک تا ایم۔اے امتحانات دلوانے کا نظم

لڑکیوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ، ادب، سیرت، تاریخ کے علاوہ انگریزی زبان کے اعدادیہ تا فضیلت چھ سال تعلیم کا بہترین نظم ہے

رابطے کے لیے پتہ:
JAMIATUL BANAT AL-ISLAHIYAH
#16-3-993/1, NEAR DAWN HIGH SCOOL
OFFICERS COLONY, NEW MALAKPET,
HYDERABAD(T.S) INDIA 500036

نصب العین: انقلاب بذریعہ تعلیم قرآن وسنت کی گہری بصیرت، شہادت حق، احیائے دین کی استعداد اور امت کے لیے داعیانہ، مجاہدانہ اور قائدانہ کردار کی حامل "المرأۃ الصالحۃ" ٹیم کی تیاری۔

☆شعبہ تحفیظ القرآن اور شعبہ ابتدائیہ وعالمیت کے پہلے سال میں داخلے سال بھر جاری رہیں گے۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے خواہشمند سرپرست حضرات سے اپنی لڑکیوں کے ہمراہ جلد رجوع ہونے کی خواہش کی جاتی ہے۔

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد کا استحکام وقت کا اہم تقاضہ اور ملی فریضہ ہے۔ اس اہم مرکز کی تعمیر وترقی ک لیے مالی اور اخلاقی تعاون فرما کر ہمارے حوصلے کو قائم رکھیں۔

ناظم: مولانا عبدالعلیم اصلاحی
موبائل 9676202819

شیخ اسماء امروز (ایم۔اے سال دوم) مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)

ادا جعفری اوران کا ذوق مطالعہ

ادا جعفری کا اصل نام عزیز جہاں تھا۔ان کی پیدائش ۲۲ اگست ۱۹۲۴ء کو بدایوں، یوپی میں ہوئی۔تقسیم کے وقت وہ پاکستان ہجرت کر گئیں۔ان کا انتقال ۱۲ مارچ ۲۰۱۵ء کو کراچی میں ہوا۔ادا جعفری کو پاکستان کی بڑی شاعرات میں شمار کیا جاتا ہے۔انہوں نے اردو ادب میں حقوق نسواں کی آواز اٹھائی۔ ان کی شاعری میں قدیم اور فرسودہ رسم و رواج اور عورتوں پر لگنے والی پابندیوں کے خلاف بغاوت کا جذبہ دکھائی دیتا ہے۔

ادا نے بدایوں کے طبقۂ اشرافیہ کے ایسے گھرانے میں آنکھیں کھولیں جہاں کا ماحول مذہبی تھا۔لڑکیوں کی تعلیم قرآن مجید تک محدود تھی۔عورتوں کو اکیلے گھر سے نکلنے کی اجازت تک نہ تھی۔لڑکیوں کا شعر کہنا اخلاق کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ ایسے ماحول میں پیدا ہو کر عزیز جہاں سے اداؔ بننے تک کے اس سفر میں ان کی شخصیت کو پروان چڑھانے اور نکھارنے میں ان کے کثرتِ مطالعہ کا اہم رول ہے۔ادا کو بچپن سے ہی کتابوں کے مطالعے کا بے حد شوق تھا۔وہ چھپ کر گھر کی لائبریری کی کتابوں کا مطالعہ نہایت ذوق و شوق سے کرتی تھیں۔

ادا جعفری آج جس مقام پر فائز ہیں، وہ نہایت ہی محنت و مشقت اور بہت کچھ کھونے کے بعد انھیں حاصل ہوا۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ جس نے ان کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا، ان کے والد کی موت ہے۔والد کی موت کا ان کے ذہن پر بے حد گہرا اثر پڑا جس کے بعد وہ خاموش مزاج اور تنہائی پسند ہوگئیں۔اس نازک وقت میں ان کی والدہ نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور انہوں نے ادا کو ذہنی پریشانی سے بچانے کے لیے ان کے سامنے کھلونوں کی بجائے کتابیں رکھ دیں ۔یہاں سے ادا کو کتابوں کے مطالعے کا ذوق شروع ہوا۔ادا نے ایک جگہ لکھا ہے:

’’اور پھر امی نے لکھنے پڑھنے کی طرف راغب کیا۔یہ میرے لیے نئی دنیا کی دریافت تھی۔‘‘

ادا کی والدہ نے ان کو تنہائی سے نکالنے کے لیے جو ذریعہ اختیار کیا وہ نہایت ہی کارآمد ثابت ہوا اور اس نئی دنیا سے ادا کو اتنی رغبت ہوگئی کہ وہ اپنے گھر کے بزرگوں سے چھپ کر کتابوں کا مطالعہ کرنے لگیں۔ان کے مطالعہ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ لائبریری میں چپکے سے پہنچ جاتیں، کتابوں کے ڈھیر سے کسی آسان کتاب کا انتخاب کرتیں اور وہ اسے بار بار پڑھتیں، ساتھ ہی ساتھ اس کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتیں۔مطالعے کے درمیان ان کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔کبھی کوئی لفظ سمجھ میں نہ آتا تو کبھی کسی کا معنی لیکن کبھی انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور نہ ہی مطالعہ چھوڑا بلکہ وہ ان مشکلات کو حل کرنے کا راستا ڈھونڈ لیتیں۔وہ ان مشکلات کو حل کرنے کے لیے لغات سے استفادہ کرنا چاہتی تھیں۔لیکن لغت خریدنے کی استطاعت نہ تھی۔ایک دفعہ ان کے نانا نے ان کا امتحان لیا اور وہ اس میں کامیاب ہوگئیں۔نانا نے پوچھا انعام میں کیا چاہیے تو ادا نے لغت کی خواہش ظاہر کی جبکہ ایسے موقوں پر لڑکیاں کپڑے اور زیورات کی فرمائش کرتی ہیں۔ادا کی لغت کی فرمائش سے ان کے ذوقِ مطالعہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔یہ اسی

مطالعے کی دین ہے کہ گھر سے باہر نہ نکلنے کے باوجود انہوں نے کتابوں کے ذریعہ پوری دنیا کا مطالعہ کیا اور معاشرے کو سمجھنے کی کوشش کی۔حویلی میں رہ کر انہوں نے حویلی کی عورتوں کی زندگی اور پوری دنیا کی عورتوں کی زندگی کی صورت حال کا ایسا نقشہ پیش کیا جو حقیقت وواقعیت سے بہت قریب ہے۔وہ حویلی کی عورتوں کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''عورت کے دکھ درد میں نے آنکھ کھولتے ہی دیکھے اور بہت قریب سے دیکھے ہیں۔عورت کا سب سے پہلا روپ جو میں نے دیکھا وہ میری ماں کا تھا۔''

ادا کا سب سے دلچسپ مشغلہ کتابوں کا مطالعہ تھا۔وہ کتابوں میں رفاقت تلاش کرتی تھیں۔ان کا زیادہ تر وقت مطالعہ میں گزرتا تھا۔

''رفاقت کی تلاش میں کتابوں کے پاس جانا بڑی دل کش اور محبوب مصروفیت تھی۔شاید کبھی انھوں نے بھی اسی طرح دوستی اور رفاقت تلاش کی ہوگی۔''

الغرض ادا جعفری کی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی اس کامیابی کے پس پشت جو عوامل کارفرما ہیں ان میں سب سے اہم ان کا ذوق مطالعہ ہے۔اسی خصوصیت کی بہ دولت وہ اردو شاعری میں اتنا بلند مقام حاصل کر سکیں۔

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

Consultation Time
Morning:11:00 am to 2:30 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony Tolichowki Hyderabad - 500008 T.S India

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم (اقامتی وغیر اقامتی ادارہ)

شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد

زیر انتظام : شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Ac No: 1327104000065876 Bank Name: IDBI
Ac N: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBkL0001327. Branch: Charminar Hyderabad (T.S)

بانی وناظم: مولانا ڈاکٹر مفتی محمد محامد ہلال اعظمی۔موبائل: 9392533661